

(افسانے)

کھیل

<http://www.pakistanconnections.com/ebooks>
itsurdu.blogspot.com

خدیجہ مستور

کھیل

(افسانے)

itsurdu.blogspot.com

خدیجہ مستور

کھیل

شکیل چاہتا تو نسرین کو تھا لیکن ہاشمہ کو بنانے میں اسے بڑا مزا آتا۔ نسرین واقعی حسین تھی۔ لیکن بیچاری ہاشمہ بس یونہی سی تھی۔ لمبا سیاہ چہرہ، بھداسا جسم، ہاں آنکھیں واقعی اچھی تھیں اس کی۔ بڑی بڑی سیاہ سی، بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ کہہ رہی ہیں۔ اور تو اس میں کوئی بھی ایسی بات نہ تھی جس سے انسان کا دل کھینچتا۔ ایک نسرین تھی کہ پیاری پیاری اداؤں کا قافلہ ہر وقت ساتھ رہتا۔ ماں کی آنکھوں کا نور، باپ کے دل کا سرور، ایک ہی بیٹی تھی سکول جانا اور پھر سارے فرصت کے اوقات اپنے ماموں زاد بھائی شکیل کے ساتھ چہلیں کر کے گزار دیتی۔ شکیل اسے چاہتا اور وہ شکیل کو دونوں کی بچپن ہی میں منگنی ہو چکی تھی، نسرین کو ہاشمہ سے سخت نفرت تھی۔ صرف اس لیے کہ وہ بد صورت تھی اور چار سال سے اس کے باپ کے ٹکڑوں پر پڑی ہوئی تھی۔ ہاشمہ کے والدین مر چکے تھے۔ چچا نے از رہ کرم اسے اپنے پاس رکھ لیا تھا اور وہ بھی انتہائی خاموشی سے بے رحم چچی، مغرور نسرین اور شریر شکیل کے ساتھ اپنی زندگی گزار رہی تھی۔ اس پر بھی اسے چین نہ تھا۔ فرصت کے اوقات میں جب وہ چپ بیٹھی اپنی کٹھن زندگی کے متعلق سوچتی تو شکیل اسے چھیڑتا۔ نسرین اس کی ہمت بڑھاتی اور وہ اپنی بے بسی پر رو پڑتی۔

ایک مختصر سادالان جس میں ایک پٹنگ، دو کرسیاں، ایک چھوٹی سی میز مقررینے سے لگی ہوئی تھی۔ میز پر ایک خوبصورت فریم رکھا تھا جس میں اس کے والدین کی تصویر لگی ہوئی تھیں۔ جنہیں وہ اکثر غور سے دیکھا کرتی، میز کے دوسری طرف چند کتابیں رکھی ہوئی تھیں جنہیں وہ زیادہ دل گھبرانے پر پڑھا کرتی۔ دالان کے دونوں دروں میں اس نے موٹے موٹے ٹاٹ کے پردے ڈال رکھے تھے اور اس کے خیال میں دالان بالکل محفوظ ہو گیا تھا۔ اس کے دالان میں کوئی بھی آنے کی زحمت نہ کرتا سوائے شکیل کے۔ وہ دوپہر کے سنائے اور رات کی تاریکی میں اس کے دالان میں گھس جاتا اور کھنکھنوں اسے ستایا کرتا۔

مئی کی دوپہر بڑے غضب کی لو چل رہی تھی۔ گھر کے بڑے بوڑھے کمرے بند کئے سو رہے تھے۔ نسرین اور شکیل اپنے کمرے میں بیٹھے جیومیٹری کا ایک سوال حل کرنے میں الجھے ہوئے تھے۔ شکیل نسرین کی مدد کر رہا تھا۔

”ہو گیا بھی حل!“ نسرین نے کاپی میز پر رکھ دی۔

”کتنا مشکل تھا میں بھی چکرا گیا!“

”تو آؤ تمہارا سرد بادوں۔“ نسرین نے شکیل کی انگلیاں اپنی مٹھی میں داب لیں۔

”ارے نہیں! بھلا تم اپنے ہاتھوں سے میرا سرد باؤ ذرا میرا دماغ تھک گیا ہے۔“ اس نے نسرین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔
دونوں کی نگاہیں ٹکرا کر لڑکھڑا گئیں۔

”دماغ تھک گیا ہے تو۔۔۔“

”تو ہاشمہ سے سردیوں۔“ اس نے بات کاٹ دی اور دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

”وہ شاید سمجھتی ہے کہ تم اسے چاہنے لگے ہو؟“

”ارے ابھی نہیں کیونکہ جانتی ہے کہ تمہیں چاہتا ہوں۔ کجنت بہت بچکتی ہے۔“

”مزا تو جب ہے کہ اسے تمہاری محبت کا یقین ہو جائے۔“ وہ اپنے ہونٹ پچکار کر ہنسی روکنے لگی۔

”ارے اگر اسے یقین نہ دلا دوں تو میرا نام شکیل نہیں!“ اس کی شیر آکھیں ناچ رہی تھیں۔

”اور وہ میری جان اس وقت ہوں گی کہاں؟“ شکیل نے پوچھا۔

”اپنے محل میں!“ نسرین نے فوراً جواب دیا۔

”کیا کہنے میرے رانی کے۔ ذرا بیٹھی رہنا میں ابھی آتا ہوں۔“ وہ تیر کی طرح کمرے سے نکل کر ہاشمہ کے دالان میں پہنچ گیا۔

وہ لیٹی ہوئی ایک کتاب پڑھ رہی تھی۔

”رانی صاحبہ!“

”فرمائیے!“ وہ گھبرا کر اٹھ گئی۔

”ملکہ عالیہ کے حضور میں کچھ عرض کر سکتا ہوں؟“

”آخر شکیل تم ملکہ کہہ کر میری غربت کا مضحکہ کیوں اڑاتے ہو؟“

”ایں! یعنی کہ تم غریب ہو؟ میرا تو خیال ہے کہ جس کے پاس حسن کی دولت ہو وہ کبھی بھی غریب نہیں کہلا سکتا!“ وہ دیدے گھماتا

ہوٹھٹ سے ہاشمہ کے پاس بیٹھ گیا۔

”میں خوبصورت ہوں یا بد صورت تمہیں اس سے کوئی مطلب نہ ہونا چاہیے۔“ ہاشمہ نے شکیل کے پاس سے سرکتے ہوئے کہا۔

”ہونا کیوں نہ چاہیے مجھے تم سے محبت ہے، کوئی میرے دل سے پوچھے۔“ وہ اس کے پاس سرک گیا۔ اور ایسی سنجیدگی سے منہ بنایا کہ غریب ہاشمہ سمجھ بھی نہ سکے کہ وہ اسے بنا رہا ہے۔

”الگ ہٹ کر بیٹھو، معلوم ہوتا ہے کہ تم نے مجھے بنانے کی قسم کھائی ہے۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”خوب اگر تم ایسی باتیں نہ کرو گی تو بھلا میرا دل کیونکر نہ ٹوٹے۔“

”شکیل! میں تم سے کہے دیتی ہوں کہ تنہا میرے کمرے میں آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ورنہ اچھا نہ ہوگا۔“

”کیا ہوگا؟“

”میں چچا جان سے شکایت کر دوں گی۔“

”کردینا، میں اپنے دل سے مجبور ہوں۔“ شکیل نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”چھوڑو! یہ کیا حرکت ہے؟“

”مجھے نہ جھڑکو ہاشمہ، میں تمہیں چاہتا ہوں! آہ!“ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر آگے جھکا جیسے واقعی اس کے دل میں درد ہو رہا ہو۔

”چلے جاؤ یہاں سے!“ وہ رو پڑی۔

”ارے رونے کیوں لگیں، لو میں جاتا ہوں، لیکن اب تم سے کیا کہوں!“ وہ مسکراتا ہوا آنکھیں نہچا تا سیدھا کمرے سے نکل گیا۔

نسرین اس کا انتظار کر رہی تھی۔ دونوں منہ داب کر قہقہے لگانے لگے۔ بیچاری ہاشمہ پڑی سسک رہی تھی۔

خادمہ چھٹی پر تھی اس لیے غریب ہاشمہ ہی کو کھانا پکانا پڑا۔ اکیلی جان لاکھ جلدی کر رہی تھی پھر بھی دن کے بارہ بج گئے اور کھانا تیار نہ ہوا۔ اس پر ستم یہ کہ شکیل موقع پا کر وہاں پہنچ گیا۔ وہ پتیلی دوپٹے سے پکڑ کر اتار رہی تھی۔ شکیل جو سر پر سوار دیکھا، تو پتیلی ہاتھ سے

چھٹ کر گر گئی۔ سارا سالن زمین پر گر کر بھوکوں کا منہ چڑانے لگا، وہ تھی کہ چچی کے خوف سے تھر تھرا کانپنے لگی۔

”تم یہاں کیوں آئے؟ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ خاموش کھڑا دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔

”اب چچی کتنی خفا ہوں گی؟“ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”میں پوچھتا ہوں کہ آخر میری موجودگی میں تمہارے ہاتھ کیوں کانپنے ورنہ پتیلی کبھی نہ گرتی۔“ اس نے ہاشمہ کی آنکھوں میں

آنکھیں ڈال دیں۔ لبوں پر ایک شریر تبسم ناچ رہا تھا، ہاشمہ سے کوئی جواب نہ بن آیا۔ بھلا وہ یہ کیسے کہتی کہ اس کی موجودگی سے وہ

گھبراتی ہے۔ اس کا ننھا سادل ایک دم دھڑکنے لگتا ہے اور وہ اپنے دل کی کمزوری سے خود ہی کانپ اٹھتی ہے۔

”جواب دو!“ اس نے اسے چپ دیکھ کر کہا۔ وہ پھر بھی خاموش ہی تھی۔

”مجھ سے محبت کرتی ہو اسی لیے۔“ اس نے آنکھیں نچا کر کہا اور سینہ تان کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

”ہٹوا لگ‘ پھر وہی بیہودگی!“ وہ اس کے لمس سے کانپ اٹھی۔

”اچھی ہاشمہ! کب تک ایسی باتیں کرو گی! اف خدا! کاش میں تمہیں اپنا دل دکھا سکتا۔“ دھواں لگنے سے کھلیل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”ہاشمہ میری آنکھوں میں بڑی سے بڑی مصیبت پر آنسو نہ آئے تھے لیکن آج۔۔۔!“

اس نے ہاتھوں سے مل کر آنکھیں سرخ کر لیں۔ آنسو دکھانے کے لیے موقع اچھا تھا۔ ہاشمہ نے اپنی جھکی ہوئی نظریں اوپر اٹھائیں تو سچ مچ کھلیل کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اس کا دل پسچ گیا۔ وہ اس وقت اپنے دل کو بے انتہا کمزور پارہی تھی۔

”چلے جاؤ یہاں سے کھلیل! ورنہ چچی کتنی خفا ہو گی۔“

”ہاں میں جاتا ہوں لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم کبھی اپنے پاس آنے کو تونہ روکو گی۔“ اس نے اپنی آواز کو پردرد بنا کر کہا۔ ہاشمہ نے کچھ جواب نہ دیا اور منہ پھیر کر گرے ہوئے سالن کو دیکھنے لگی۔ خالی پتیلی جیسے اسے منہ چڑا کر کہہ رہی ہو کہ اب دیکھنا کیسی خبر لی جاتی ہے۔ لیکن وہ سوچ رہی تھی کہ کیا واقعی کھلیل اسے چاہتا ہے۔ لیکن نسرین کا وجود اس خیال کو پختہ نہ ہونے دیتا تھا۔ زینے پر کھٹ پٹ ہوئی۔ کوئی اوپر سے آ رہا تھا کھلیل دبے پاؤں باورچی خانے سے سرک گیا۔

”کھانا تیار ہو گیا ہاشمہ؟“ چچی نے آتے ہی سوال کیا۔ پھر گراہو سالن دیکھ کر غصے سے سرخ ہو گئیں۔ لیکن تھیں کچھ نیکی کے دم میں۔ کہا سنا نہیں کھڑی گھورتی رہیں۔

چچی یہ گر گیا ہے ابھی ترکاری پکائے لیتی ہوں۔“

”گر گیا! ابھی ترکاری پکائے لیتی ہوں۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں۔ ہاشمہ جلدی جلدی آلو چھینے لگی۔

شام کے جھپٹے میں سب کو ٹھہرے پر چہل قدمی کر رہے تھے لیکن ہاشمہ نیچے ہی چھوٹے سے آگن میں بیٹھی سوچ رہی تھی بس کھلیل کے لیے موقع مناسب تھا۔ وہ نسرین سے اشاروں ہی اشاروں میں کہہ کر نیچے اتر آیا۔

”کیا ہو رہا ہے میری رانی؟“ اس نے آتے ہی چیخے سے اپنے بازو اس کی گردن میں حائل کر دیئے۔

”اف!“ وہ کانپ کر رہ گئی اور گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگی کہ کوئی دیکھتا نہ ہو۔

”کھلیل! کھلیل! کیا تمہیں مجھ پر رحم نہیں آتا جو یوں عاجز کرتے ہو۔“ وہ اپنی بے کسی پر رونے لگی۔

”رحم! اے ہاشمہ میرا تو یہ دل چاہتا ہے کہ تمہیں یہاں سے لے جاؤں اور پھر تمہیں اپنی رانی بنا کر رکھوں۔“ اس نے بازو اور بھی

سخت کر دیئے۔ اس وقت وہ ایک کامیاب عاشق کے پارٹ ادا کر رہا تھا۔

”چھوڑ مجھے خوفناک درندے!“ ہاشمہ اس کے بازوؤں سے نگل کر اسے گھورنے لگی۔

”ہاشمہ! معاف کرنا میں اپنی محبت میں یہ سب کچھ کر گیا۔ ورنہ مجھے تم سے پاک محبت ہے اور یہی چاہتا ہوں کہ تم کو دور سے دیکھا

کروں۔“

”کھلیل! تم کیوں فریب محبت دے کر میری زندگی برباد کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ آخر تم کیوں نہیں کہتے کہ ہاشمہ مجھے تم سے

نفرت ہے، تم بد صورت ہو، میں نسرین کو چاہتا ہوں، وہ میری منگیتر ہے۔ تم سے کوئی محبت نہیں کر سکتا، تم دنیا میں نفرت کرنے کے لیے

بنائی گئی ہو؟“ اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا اور منہ تمام کر سکنے لگی۔

”کون کہتا ہے ہاشمہ کہ تم بد صورت ہو۔ کاش کوئی میرے دل سے پوچھے مجھے نسرین سے نفرت ہے۔ میں شادی سے انکار کر

دوں گا۔“ اس نے کہا شیر آنکھیں ناچ رہی تھیں اور لبوں پر ایک فخریہ تبسم تھیل رہا تھا۔ نسرین ہنسی رو کے کوٹھے کی نیچی سی دیوار کے

پاس کھڑی نیچے دیکھ رہی تھی۔ اس نے ہاتھ سے بلانے کا اشارہ کیا اور پیچھے ہٹ گئی۔

”اف مت رو ہاشمہ جان! میرا دل ڈوبا جا رہا ہے۔ نہیں مانو گی۔ لو میں جاتا ہوں، خوب رونا اکیلے میں۔ میری آنکھیں یہ

اندوہناک منظر نہ دیکھ سکیں گی۔“

وہ اسے روتا چھوڑ کر اوپر چلتا بنا، نسرین منتظر تھی۔ دونوں اپنے کمرے میں جا کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

”اب آئی ہے ڈھب پر میری رانی۔“

”آج تو تمہارے عشق میں ٹسوے بہا رہی تھیں۔“

”ہاں بڑے زوروں میں!“

”پھر کیا ارادہ ہے؟“

”مجھے خود اس سے محبت ہے۔ آہ میں جلا جاتا ہوں۔“

وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر آئیں بھرنے لگا۔ نسرین ہنسی سے ٹوٹی جا رہی تھی۔ دونوں نے خوب دل کھول کر قہقہے لگائے اور بیچاری ہاشمہ اپنے محفوظ دالان میں جا کر منہ چھپائے سسک رہی تھی۔ جہاں دن دیہاڑے ایک شریک کھلاڑی نے اپنے کھیل کھیلنے کے لیے اس کے دل پر ڈاکہ ڈال دیا تھا۔ اس کے سینے میں شعلے اٹھ رہے تھے اور آہیں بن کر دھواں نکل رہا تھا۔ گھر کے بڑے بوڑھے کہیں تفریح کے لیے گئے ہوئے تھے نسرین اور شکیل باوجود اصرار کے گھر ہی میں رہے۔ اور رہ گئی ہاشمہ تو اسے اپنے ساتھ کون لے جاتا۔ وہ اپنے دالان میں پڑی رو رہی تھی اس لیے کہ اب وہ شکیل سے نفرت نہ کر سکتی تھی اور وہ اسے چاہنے پر مجبور تھی۔ وہ شکیل کا آج اپنے دالان میں انتظار کر رہی تھی کہ وہ آ جائے تو وہ اس سے کہہ دے گی کہ اب وہ اس سے بناوٹی نفرت کا زیادہ دن انتظار نہ کر سکے گی اور پیچھے سے شکیل نے آ کر اس کی پسلیوں کو گدگدانا شروع کر دیا۔

”کیا کر رہے ہو شکیل!“ اس نے شکیل کا ہاتھ ہلاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

”ارے یہ تم رو کیوں رہی ہو؟“

”آگ لگ گئی۔“

”کہاں؟“ وہ مسکرا رہا تھا۔

”دنیا میں!“ اس نے اپنی بے چین آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال دیں۔ ”لیکن تم اور تمہارا دالان تو بالکل محفوظ ہے۔ پھر آگ کیسی اور کہاں؟“

”دل کی دنیا میں!“

کون ہے وہ خوش قسمت جس نے آگ لگائی؟“ وہ بالکل اس کے قریب ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں دوسیاہ جھانکتی ہوئی شریر آنکھوں سے نکرا گئیں۔

آگ لگا کر پوچھتے ہو کہ کس نے لگائی۔“

”سچ! کیا تم بھی مجھے چاہتی ہو رانی؟“ وہ ہاشمہ کے دل میں آگ لگا کر نازاں تھا۔

اس نے جواب تو کچھ نہ دیا اس کے زانو پر سر رکھ کر رونے لگی۔

”بھئی رومت! میرا دل دکھتا ہے۔“ وہ اس کا سر طلبے کی طرح بجانے لگا۔ اس کی نگاہیں پردے پر جمی ہوئی تھیں۔ جھانکتی ہوئی

آنکھیں آنکھوں ہی آنکھوں میں ہنس ہنس کر اشارے سے بلارہی تھیں۔

”نسرین کہا ہے شکیل؟“ ہاشمہ نے سراٹھا کر پوچھا۔ آنکھیں غائب ہو گئیں۔

”تم اس کی کیوں فکر کرتی ہو؟ سو رہی ہے۔“

”اب جاؤ شکیل ورنہ وہ جاگ اٹھے گی۔“

”لو میں جاتا ہوں تم کو تو میرا بیٹھنا ہی برا لگتا ہے۔“ وہ برا سامنہ بنا تا دالان سے نکل گیا۔ باہر نسرین کھڑی تھی۔ اس نے اس کا پر تپاک خیر مقدم کیا اور ہاشمہ آج ایک عرصے کے بعد اپنے آپ کو خوش پارہی تھی۔ اس کے سامنے شکیل کی مسکراتی صورت تھی اور وہ ان شریر آنکھوں میں اپنی زندگی کی آئندہ خوشیاں تلاش کر کے خود بھی مسکرا رہی تھی۔

شکیل اپنے مختصر سے کمرے میں لیٹا ایک موٹی سی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس کے ارد گرد کتابیں پھیلی ہوئی تھیں۔

”کیوں جی یہ تم سب طرف کتابیں کیوں بھجلا دیتے ہو؟“ نسرین نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا اور کتابیں درست کر کے میز پر لگانے لگی۔ شکیل نے اسے بڑی ہی حسرت بھری نظروں سے دیکھا اور پھر پڑھنے میں مشغول ہو لیا۔

”ارے کیا ہوا شکیل! تم رنجیدہ کیوں ہو؟“ وہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔ شکیل نے کوئی جواب نہ دیا۔

”تم بولتے کیوں نہیں ہو شکیل! میرا دل ڈوبتا ہے جواب دو۔“ اس نے اس کے گلے میں بائیں ڈال دیں۔ کھڑکی پر پڑے ہوئے پردے کو ہلکی سی جنبش ہوئی۔ دوسیا آنکھیں اندر جھانکنے لگیں۔

”آگ لگتی؟“ شکیل نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں داب کر کہا۔

”ہوں! کہاں؟“ وہ مسکرا رہی تھی۔

”دنیا میں!“

”لیکن تم اور تمہارا کمرہ تو بالکل محفوظ ہے۔ پھر آگ کیسی اور کہاں؟“ وہ اپنی ہنسی ضبط کر رہی تھی۔

”دل کی دنیا میں!“ شکیل نے رونی صورت بنالی۔

”کون ہے وہ خوش قسمت نے جس نے آگ لگائی؟“

”آگ لگا کر پوچھتی ہو کس نے لگائی!“ وہ اپنی آنکھوں میں رومال رکھ کر اوں کرنے لگا۔ جھانکتی ہوئی آنکھوں سے شعلے

برس رہے تھے۔

”تو کیا سچ! تم مجھے چاہتے ہو راجہ؟“

”ہاشمہ! کیا میری محبت کی یہ ہی قدر ہے؟“ وہ ہاتھ سے ٹکے ہوئے شکار کو پھر سے پھانسا چاہتا تھا۔

”چاہتے ہو تو چاہا کرو۔ لیکن یاد رکھو کہ ایک طرفہ محبت بہت مہنگی ہوتی ہے۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے، جو اس نے کھیل کی طرف سے منہ پھیر کر پونچھ لیے۔

”ہاشمہ تم نے۔۔۔!“

”میں کچھ نہیں سننا چاہتی اور نہ زیادہ دن یہ محبت کا کھیل کھیلنا پسند کرتی ہوں۔ مجھے دنیا میں اور بھی کام ہیں!“ اس نے بات کاٹ کر کہا اور مسکرانے لگی۔ کھیل سمجھ گیا کہ اب وہ بنانے میں نہیں آئے گی۔

”تو سن لو کہ میں خود تم سے مذاق کرتا تھا۔ ورنہ تم ہو کہاں کی بڑی حسین!“

اس نے دیدے گھما کر کہا اور پاؤں پختازن سے نیچے آ گیا۔ ہاشمہ ایک تھکے مسافر کی طرح زمین پر بیٹھ گئی اور سوچنے لگی کہ آیا وہ اس شریر کھلاڑی کو بھلا بھی سکے گی یا نہیں؟

”کاش! اس نے بھی یہ محبت کا مہنگا سودا نہ خریدا ہوتا اور سب کچھ کھیل ہی سمجھا ہوتا۔۔۔“ اس کے آنسو بڑی تیزی سے بہہ بہہ کر زمین میں جذب ہونے لگے۔

”آؤ بچوں کچھ کھیلیں!“ کھیل نیچے ملازمہ کے بچوں سے بھڑ رہا تھا اور کسین تھپے لگا رہی تھی۔ ہاشمہ نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔

دو سال بیت گئے کھیل اور نسرین کی شادی ہو چکی تھی۔ لیکن ہاشمہ آج بستر مرگ پر پڑی تھی۔ ڈاکٹر جواب دے چکے تھے۔ کیونکہ دق کا تیسرا درجہ تھا اب ہاشمہ سے سب کو ہمدردی تھی۔ چچا بار بار دست شفقت پھیرتے نسرین اسے دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھراتی۔ کھیل بھی اس کے دالان میں بار بار چکر لگا کر آہیں بھرتا اور چچی نے تو کئی راتیں اس کے سرہانے بیٹھ کر گزار دیں۔ تیرہ برس کی جوان دل میں حسرت و ارمٰان لیے دنیا سے چلنے کا سامان کر رہی تھی۔ اور اس کے آخری وقت کی تیز تیز سانسیں درود یوار سے ٹکرا رہی تھیں۔

”چچی!“ اس نے آنکھیں کھول کر آہستہ سے پکارا۔

”ہاں ہاشمہ میری بیٹی!“

”کھیل کو بلا دیجئے۔“

”میں یہیں ہوں ہاشمہ۔“ وہ اس کے سر ہانے سے ہٹ کر پاس گیا۔ چچی آپ اور نسرین کچھ دیر کے لیے باہر چلی جائے۔ مجھے کھیل سے کچھ کہنا ہے!“ اس نے امید بھری نظروں سے چچی کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں باہر چلی گئیں۔ چند منٹ کے مہمان کی بات بھلا کیا تائیں۔

”کھیل! یہاں بیٹھو میرے پاس۔“

”ہاں کہو ہاشمہ!“

وہ اس کے قریب بیٹھ کر اس کا ہاتھ سہلانے لگا۔ ”آؤ آج پھر محبت کا کھیل کھیلیں، جو تم اب سے دو سال قبل کھیلا کرتے تھے۔“ اس نے کھیل کا ہاتھ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں تھام لیا۔

”تم یہ کیا کہہ رہی ہو ہاشمہ؟ وہ حیرت سے دیکھنے لگا۔ آنکھوں کے سامنے سے ایک پردہ سا اٹھتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔“

”ہاں کھیل! وہی کھیل، کیا تم اتنی جلدی بھول گئے۔ میرے شریر کھلاڑی ایک بار اپنی آنکھیں شرارت سے نچا کر پھر کہو ہاشمہ جان۔“ اس کی مردہ سی آنکھوں میں پاگل پن ٹپکنے لگا۔ کھیل غمگین اسے دیکھ رہا تھا۔

”کھیل! میرے عزیز تم چپ کیوں ہو کھیلو نا وہی کھیل۔ صرف آخری بار۔ اس کے بعد میری زندگی کا کھیل ہی ختم ہو جائے گا۔“

”مجھے معاف کر دو ہاشمہ!“ اس نے اس کے مردہ جسم کو بازوؤں میں تھام لیا۔

”معافی کس بات کی کھیل!“ یہ دنیا ایک کھیل کا میدان ہے اور ہم سب کھلاڑی، کوئی ہارے کوئی جیتے۔ میں ہاری، تم جیتے۔ اب میں جا رہی ہوں خدا معلوم کہاں۔ دنیا ہارنے والوں کی نہیں ہوتی۔“ اس کے لب کانپے آواز مدھم پڑ گئی۔ پاگل آنکھوں پر مردنی چھا رہی تھی۔

”ہاشمہ! میری عزیز مجھے معاف کر دو۔“ کھیل نے سسکتے ہوئے کہا اور ہاشمہ نے اسے دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں، لب تھرائے۔

شاید وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن موت کے کھیل کھیلنے والے کھلاڑی نے مہلت ہی نہ دی۔

”اف! قدرت کا یہ کھیل کتنا بھیانک ہے۔“ کھیل نے اسے لٹا کر اپنی آنکھوں پر رومال رکھ لیا۔

”نہیں! یہ ہمارے کھیل کا انجام تھا۔“ نسرین نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ شدت غم سے اس کے رخساروں کی سرخی غائب ہو گئی تھی۔ چچی نے آ کر اس کے مردہ جسم پر چادر ڈال دی۔ اف ہاشمہ کے محفوظ والاں میں موت کا فرشتہ بھی اپنا کھیل کھیل گیا۔



موہنی

ابھی کروٹیں بدلتے بدلتے اس کی آنکھ لگی تھی کہ جھانج کی تیز جھنا جھن نے اسے چونکا دیا۔ ”اف! نہیں سونا ملے گا“ گھر میں سوتا ہوں تو وہ اماں کے لاڈ لے کسی کو چین نہیں لینے دیتے اور اگر بیٹھک میں پڑ رہوں تو راہ گیروں کا شور اور ان عورتوں کے زیورات کی جھنجھناہٹ سونے نہ دے گی۔ معلوم ہوتا ہے اس بھری دوپہر میں ساری خدائی اس پتلی سی گلی سے گزر جائے گی۔“ اس نے ایک کروٹ لی۔ کچھ آدمی آپس میں باتیں کرتے گلی سے گزر گئے۔ جھانج کی آواز قریب ہوتی جا رہی تھی اور گلی کے کوئی دس قدم کے فاصلے پر بندھی ہوئی بھینسوں کے گلے کی گھنٹیاں لو کے نیچے جھونکوں سے ٹکرا کر زور سے بجنے لگیں۔ اس کا دل چاہا کہ چھری لے کر پہلے ان ہی کا خاتمہ کر دے۔ ورنہ یہ بھی اپنے گلے کی گھنٹیوں پر اترا لے جائیں گی۔ جھانج کی آواز تیز ہوتے ہوتے اس کے دروازے کے پاس آ کر ختم ہو گئی۔ اور کسی نے ہولے سے بھڑے ہوئے دروازے کھولے۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا ایک تیس بیس سالہ عورت اپنے کولہے پر ایک چھوٹے سے بچے کو لادے سر پر ایک چھوٹا سا رنگین ٹوکرا رکھے اندر جھانک رہی ہے۔

”کیا ہے؟“

”ہر مرنج کی جڑی بوٹی، بابو جی!“

”اندر آ جاؤ!“ اس نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

عورت اندر آ کر کھڑی ہو گئی اور مقبس نظروں سے سب کی طرف دیکھنے لگی۔ بچہ اپنی بہتی ہوئی ناک کو مڑپ مڑپ چاٹ رہا تھا اور چھوٹے سے ہاتھ سے عورت کے پھولے ہوئے پیٹ پر چھتیں مار رہا تھا۔

”بیٹھ جاؤ! اس نے کہا۔

عورت دہلیز کے پاس ہی بچے کو پیٹ کر بیٹھ گئی اور میلے کچیلے کپڑے سے ڈھکا ہوا ٹوکرا کھول کر گھاس پھوس نکالنے لگی۔ وہ پلنگ سے اٹھ کر کرسی پر دراز ہو گیا اور گھور گھور کر عورت کو دیکھنے لگا۔ وہ ایک ایسے مکان کی طرح معلوم ہو رہی تھی جو کرایہ داروں کی بدتمیزیوں سے جگہ جگہ سے کھد گیا ہو پھر بھی یہی معلوم ہوتا تھا کہ مکان کبھی شاندار ہوگا۔

”بابو جی!“ اس نے ایک بوٹی ہاتھ میں لے کر کہنا شروع کیا۔ ”یہ مجلہ جس کام کے اجر بالوں کو کالا بھٹ کر دیتی ہے۔ اور اگر بابو جی بوڑھے لوگ بھی اسے لگائیں تو ایک مرتبے جوان معلوم ہوں۔“ عورت اس کے گھنگریالے بالوں میں چند سفید بال دیکھ رہی تھی۔

”سچ؟“ اس نے کہا۔

”ہاں بابو جی!“ اس نے اپنی بڑی بڑی میلی سی آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال دیں جیسے وہ صداقت سے چھلکتے ہوئے دو جام پلا رہی ہو۔

”بھلا مجھے اس کی کیا ضرورت ہے؟“

”تو بابو جی یہ دوائی۔۔۔۔۔“ اس نے پہلی دوائی کی جگہ دوسری بوٹی رکھتے ہوئے کہا۔ ”کیسا ہی مرج ہو بابو جی۔ سب کو پھاندہ کرتی ہے آپ تو کھد ہی سمجھدار ہیں۔ میں اب کا کھوں۔ آجما کے دیکھ لو جب کی بات جو پٹ پر جائے۔“ وہ اس کے زرد چہرے کو بری طرح گھورنے لگی۔

”میں کچھ بیمار تو نہیں۔ اگر تم کو پیسوں کی ضرورت ہو تو یونہی لے جاؤ۔“ وہ اسے دیکھ کر مسکرانے لگا اور زرد چہرے پر سرخیاں دوڑنے لگیں۔ گرمیوں کی بھری دوپہر اور تنہائی، اگر وہ اس سے دلچسپی لے بھی رہا تھا تو کیا ہرج، کیا لوگ آثارِ صنادید کو شوق سے نہیں دیکھتے۔

”ہم ایسے نہیں لیتے پیسے!“ عورت کچھ سوچنے لگی۔ بچے کی بہتی ہوئی ناک ہونٹوں سے گزر رہی تھی۔ جسے وہ چٹارے لے کر چاٹ رہا تھا۔

بابو جی! یہ لے لو موہنی جسے چاہتے ہو اسی کے سامنے گھس کر ماتھے پر لگاؤ۔ اگر آسا پوری نہ ہو جائے تو دام واپس لے لینا یوں سمجھو بابو جی کہ خود تمہارے کدموں پر نہ گرے تو جب کی بات۔“ اس نے اپنی تجربہ کار آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑ دیں، وہ کرسی سے اٹھ کر اس کے ٹوکڑے کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ اپنے ہونٹ داب کر مسکرائی۔ ایسی مسکراہٹ جیسے وہ کہہ رہی ہو کہ میں نے اپنی زندگی کے بہت سے دن تم لڑکوں کی طبیعت ہی پہچاننے میں گزارے ہیں۔

”یہ چیز تو بڑی اچھی ہے!“ وہ موہنی کو اپنی ہتھیلی پر رکھ کر شوق سے دیکھنے لگا۔

”ہاں بابو جی! پر قیمت دو روپیہ سے کم نہ ہوگی۔“ عورت نے اس کے شوق کو دیکھتے ہوئے قیمت چوگنی کر دی۔ حالانکہ تھوڑی ہی دیر گزری ہوگی وہ وہ موہنی ایک چھوکرے کے ہاتھ آٹھ آنے میں بیچ آئی تھی۔

”دو کیا تم چار لے لو، لیکن بات نہ بنی تو؟“

”بنے گی کیسے نہیں بابو جی! جانے کتنے لوگوں کی آشا پوری ہوئی آج بھی جب ہم کو دیکھ پاتے ہیں تو جی سے دعائیں دیتے

ہیں۔“

”ہوگا ایسا ہی، لیکن تمہارے جیسی نہ معلوم کتنی عورتیں دوائیں پیچتی پھرتی ہیں اور خوب جھوٹ بول کر کوڑے کھڑے کر لیتی ہیں۔“

”ہوں گی وہ اور بابو جی! جب ہماری دبائی پٹ پڑ جائے تو کہنا پھر!“ اس نے صداقت سے اپنی آنکھیں نکال دیں۔

”لو!“ اس نے قمیص کی جیب سے دو روپے نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے اور موہنی لے کر جیب میں ڈال لی۔ لیکن پھر فوراً

اسے خیال آیا کہ وہ دو روپے دے کر الوداع ہے۔ اگر جڑی بوٹیوں میں ایسا ہی اثر ہوتا تو بھلا کیوں کوئی عاشق اپنی قسمت کو روئے۔

لیکن پھر اس کے پہلے خیال کی تردید اس خیال سے ہو گئی کہ خدا نے جڑی بوٹیوں میں بڑا اثر پیدا کیا ہے اور اگر کچھ بھی نہ تو ہوا تو کیا

غریب کی چند دن کی روٹی ہی چل جائے گی۔ کوئی یہ دو روپے میری قسمت تو نہ لے جائیں گے۔

عورت اپنے چندری کے پلو میں روپے باندھ کر نوکرہ ٹھیک کر رہی تھی بچہ ایس کر کے اس کے پلو میں بندھے ہوئے روپوں کو

کھینچنے لگا۔ جیسے کہ وہ کہہ رہا ہو کہ آج تو دو پیسے کا دودھ ہم کو بھی پلا دیجیو روٹی کے سوکھے ٹکڑے میرے پیٹ میں گڑتے ہیں عورت

نے بچے کو کو لہے پر لاد لیا اور نوکرہ اٹھا کر سر پر رکھنے لگی جس سے اس کا پیٹ اور بھی اونچا ہو گیا۔

”کھانا بہت کھاتی ہو جی پیٹ اتنا بڑا ہو رہا ہے!“ اس نے عورت کو ہنس کر دیکھا۔

”آپ ہی بابو لوگ کا کھاتے ہیں!“ عورت نے اسے تکیھی نظروں سے دیکھا اور ٹخنوں سے اونچا لہنگا گھماتی ٹھسے جانے کے لیے

بڑھی۔

”کیا کرتا ہے تمہارا آدمی؟“ اس نے عورت کو باتوں میں لگانا چاہا۔

”وہ کیا کرے گا جی! بالکل بوڑھا پھوس ہو رہا ہے بچپن ہی میں مہتاری نے باپ کے ماپھک سے بیاہ کر دیا۔ اب میں کماؤں اور

وہ پڑے پڑے کھائے۔“

”تبھی تمہارا پیٹ بڑا ہو گیا ہے!“ اس نے ہنس کر کہا اور عورت بغیر کچھ جواب دیئے بیٹھک سے نکل گئی۔ اس کی جھانج کی آواز گلی

میں گونج رہی تھی۔ وہ پلنگ پر لیٹ کر کروٹیں بدلنے لگا۔ جیب میں پڑی ہوئی موہنی اس کا دل دھک دھک کر رہی تھی۔

دو سال ہو گئے جب وہ اس گلی کے چھوٹے سے مکان میں آیا تھا اس کے گھر کے سامنے کوئی دس قدم کے فاصلے پر خاک اڑاتے

ہوئے میدان میں گھوسیوں کے کچے مکان بنے ہوئے تھے۔ شام کو وہ اکثر اپنی بیٹھک کا دروازہ کھول کر سامنے ہی کرسی پر بیٹھ جاتا اور سب سے موئے گھوسی کی لڑکی کو دیکھا کرتا جو شام کو بھینسوں کو سانی لگاتے وقت کچھ گایا کرتی اور اور اپنی کنول جیسی شفاف آنکھیں بند کر کے اپنا گال ان کے ماتھے پر رگڑا کرتی جیسے اسے اپنی بھینسوں سے بیحد محبت ہے۔ کبھی کبھی اس کی ہولناک گہری نگاہوں سے اس کی کنول جیسی آنکھوں کا تصادم ہو جاتا تو وہ نفرت سے منہ پھیر لیتی اور اپنے گورے گورے پاؤں پکلتی اپنے مکان میں گھس کر دروازہ بند کر لیتی اور وہ اس کی حسین نفرت کو دیکھ کر اس کے دل میں جیسے آگ سی لگ جاتی۔ دوسرے دن پھر وہ بن ٹھن کر بیٹھک میں آ بیٹھا اور جب اس سے نگاہیں ملتی تو وہ مسکرا کر آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے کچھ اشارے کرنے لگتا۔ لیکن جواب میں وہی متغیر نگاہیں۔ آخر اسے اپنے تئیں غصہ آنے لگتا کہ وہ ایک دو نکلے گھوسن بچی کو چاہے اور کہیں کھلی فضا گھومنے پھرنے کے بجائے وہ اس گندی فضا میں صرف اسے دیکھنے لیے گھنٹوں بیٹھا رہے اور وہ مغرور اس کی محبت کی قدر کرنے کی بجائے اسے نفرت سے دیکھ کر منہ پھیر لے۔ اس نے بھی دل میں ٹھان لی کہ وہ ایک دن اس کو رام کر کے رہے گا۔ اور پھر وہ اسے انتہائی مستعدی سے گھورنے لگتا۔ اس کی کنول جیسی آنکھیں اپنی نفرت کا اظہار کر کے اسے برابر ضدی بنا رہی تھیں۔ ایک دن دو پہر کے وقت وہ اس کے گھر کے پاس گلی میں لگے ہوئے تل پر گوری گوری پنڈلیاں کھولے پاؤں دھو رہی تھی۔ وہ بھی منہ دھوئے کے یہاں وہاں تیزی سے پہنچ گیا۔ اس نے اسے دیکھ کر اپنی گھگھریاں میں پاؤں چھپا لیے اور الگ ہٹ کر کھڑی ہو گئی تاکہ وہ منہ دھو کر چلا جائے۔ اس نے منہ دھو تے ہوئے اس سے اپنی محبت کا اظہار کر دیا۔ لیکن اس نے بھی صاف کہہ دیا کہ بابو جی! ہم باہر پھرنے والیوں کو بے اجازت مت سمجھو۔ پھر بھی وہ کہتا ہی رہا کہ میں تمہارے بغیر نہ جی سکوں گا۔ مجھے شو کر نہ مارو خوب عیش کراؤں گا اور وہ اس وقت تک کہتا ہی رہا جب تک اس نے چپکے چپکے چند گالیاں نہ پکڑا دیں اور پاؤں پیٹتی وہاں سے چلی گئی اور وہ اسے دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ اور پھر وہ اس دن سے ایک ہفتے ہوئے ضدی کی طرح ایک حسین موقع کی تلاش میں رہنے لگا لیکن اس نے بھی تنہا گلی میں آنا اور پانی بھرنا چھوڑ دیا۔ وہ شام کو اسے بھینسوں سے پیار کرتے دیکھتا اور اپنی دل کی لگی کو تھپک تھپک کر سنانے کی کوشش کیا کرتا، یوں ہی ایک سال بیت گیا اور پھر اسے معلوم ہوا کہ اس کی شادی ہو رہی ہے اور ایک دن اس نے اپنی آنکھ سے دیکھ لیا کہ وہ ڈھولک کی تانوں کے ساتھ ایک موئے لٹھ بندے کے ساتھ رخصت کر دی گئی اور وہ ایک حسین موقع کی تاک ہی میں رہ گیا۔ اس کے بعد وہ برابر میکے آتی رہی اور ایک پیاک عورت کی طرح سر سے چندری ڈھلکائے گلی میں پھرتی تل پر تنہا آتی لیکن اسے نظر اٹھا کر دیکھنے کی بھی ہمت نہ پڑتی۔ وہ تو اس کے آدمی کے ہاتھ میں ہر وقت رہنے والے موئے لٹھے کے تصور ہی سے کانپ اٹھتا اور کبھی بھولے سے ان کی نگاہیں اس سے چار ہو جاتیں، تو اسے معلوم ہوتا

کہ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہی ہو کہ ”دیکھو اب ہمیں نہ چھیڑنا“ ورنہ تم نے میرے آدمی کے ہاتھ میں رہنے والے لٹھ کو تو دیکھا ہی ہوگا۔“

لیکن آج موہنی پا کر اس کے آدمی کے لٹھ کے خوف سے سوئے جذبات ایک دم جاگ اٹھے اور اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ بھڑے ہوئے دروازے ہو لے سے کھلے اور وہ اپنی کنول جیسی آنکھیں جھکائے اس کے پاس آ رہی ہے۔ وہ خوشی سے کانپ اٹھتا۔ گرمیوں کی لمبی دوپہرا انہی تصورات میں کٹ گئی۔ اور شام کو وہ صاف ستھرے کپڑے پہن کر دیر تک اپنے بال سنوارتا رہا اور پھر بیٹھک کا دروازہ کھول سامنے کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔ کچھ کالی کلوٹی لڑکیاں سوکھے ہوئے ایلے ٹوکرے میں بھر رہی تھیں۔ اور اس کی ماں بھینسوں کو سانی لگا رہی تھی لیکن وہ کہیں نظر نہ آتی تھی وہ بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے مکان سے نکلی اور کچھ لڑکھرائی سی ٹل کی طرف بڑھی۔ اس کے سرخ سرخ پوٹے پھولے ہوئے تھے۔ ان میں سے جھانکتی ہوئی مخمور آنکھیں زمین پر جمی ہوئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی سو کر اٹھی ہے۔ اس نے جیب سے موہنی نکال کر منٹھی میں داب لی تاکہ وقت پر چوک نہ جائے۔ وہ اپنا لہنگا اونچا کر کے منہ دھونے لگی اور جب منہ دھو کر وہ اپنی لال چندری سے منہ پونچھنے لگی۔ تو اچانک اسی کی گھورتی ہوئی ہوسناک آنکھوں سے اس کی نگاہوں کا تصادم ہو گیا۔ اس نے جلدی سے موہنی ماتھے پر رگڑ لی اور محبت کے جذبات آنکھوں میں پیدا کر کے مسکرانے لگا لیکن اس کی آنکھیں جیسے کہ رہی تھیں کہ ”پھر شرارت کی“ کیا میرے آدمی کے لٹھ کو بھول گئے۔ دیکھو اب ہمیں نہ چھیڑنا۔“ وہ اپنی پتلی سی کمر پکاتی چلی گئی۔ اس نے دیکھا کہ گلی میں اس کے دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر ایک کالی میلی کچلی لڑکی کمر پر اپلوں کا ٹوکرہ رکھے ایک ہاتھ سے اپنے الجھے ہوئے گرد آلود بالوں میں کھمکھم کھجکھجا کر اسے نہ جانے کب سے دیکھ رہی تھی۔ وہ موہنی پھینک کر اس کی اس تاثیر سے بے ساختہ ہنس پڑا۔ لڑکی گھبرا کر قدم اٹھانے لگی۔ گلی کے مور سے موہنی فروش ایک بوڑھے کے ساتھ چھماچھم کرتی چلی آ رہی تھی۔ ”بابا! آجما کے دیکھو یہ دبائی اگر ایک مرتبے جو ان نہ ہو جاؤ تب کی بات۔“ وہ بیٹھک کا دروازہ بند کر کے دوسری گلی میں ہو گیا۔



پتنگ

”ارے بھیا! یہ پتنگ کیا آپ اڑائیں گے؟“ میں حیرت سے اچھل پڑی۔ دفتر سے بھیا کے ہاتھ میں ایک ننھی سی ہری پتنگ کانپ رہی تھی۔

”ہاں ارادہ تو ہے پھر؟“ وہ بچوں کی طرح ہنس رہے تھے۔ میں کہتی ہوں یہ کیا حرکت ہے؟“ بھابھی باورچی خانے سے بھاگتی ہوئی آگئیں۔

”دیکھو شہلا! اور اے تم تم دونوں کو میرے پتنگ اڑانے پر کوئی اعتراض نہ کرنا چاہیے۔ ابھی میں ایک بھی بچے کا باپ نہیں بنا۔ اس لیے مجھے حق ہے کہ اپنا بچپن نہ بھولوں۔“ وہ مزے سے زمین پر بیٹھ کر پتنگ میں چھید کر کے کئے باندھنے لگا۔ میری نظریں پتنگ پر جمی ہوئی تھیں۔ دل بے اختیار دھڑک رہا تھا۔ جیسے یہ پتنگ کوئی بہت سی خوفناک چیز ہو، بھلا ننھی منی پتنگ سے دل کی دھڑکنوں کا کیا تعلق.....؟

”چلو شہلا! تم بھی کوٹھے پر ورنہ چرخی کون پکڑے گا؟“ انہوں نے چرخی میری طرف بڑھادی۔

”مجھے نہ لے جائیے میرے بھیا!“ میں نے کہا، دل ڈوبا سا جا رہا تھا۔

”اچھا یہ بات ہے تو پھر یاد رکھنا، ہاں! انہوں نے آنکھیں نکال کر مجھے دیکھا۔

”ارے بگڑیے مت!“

”تو پھر چلو نہ میرے ساتھ!“

”اچھا چلوں گی۔“

وہ خوش ہو گئے اور میں نے اپنے دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔

”دیکھو! میں کہتی ہوں کہ تم پتنگ نہ اڑا سکو گے۔ انشاء اللہ کٹ کے رہے گی۔“ بھابی نے تپ کر کہا۔

”بس تم بیٹھی ہوئی دعا کئے جاؤ۔ خدا سننے کا ایک بھی نہیں۔“ بھیا نے تپی ہوئی بھابی کو اور تپا دیا۔

”اور چلو شہلا کی بچی! یہ تم گم سم کیوں ہو رہی ہو؟“

”کچھ نہیں!“ وہ مجھے کھینچتے ہوئے اوپر لے گئے۔

”تم یہ چرخی پکڑ کر بیٹھ جاؤ، لیکن دیکھو گم نہ ہو جانا اور ڈور ٹوٹ جائے گی۔“

”اور پھر یہ پتنگ امیدوں کے قلعے کی طرح نامعلوم کہاں ڈھسے جائے۔“

میں نے محویت میں کہہ دیا۔

”خوب!“

”ارے!“ میں کچھ جھینپ سی گئی اور چرخی تمام کراہک طرف بیٹھ گئی۔

بھیا جھٹکے دے دے کر پتنگ اڑانے لگے۔ لیکن وہ بڑھنے کی بجائے زمین پر گر کر دو جگہ سے پھٹ گئی۔

نہیں اڑے گی ایسے اوپر سے کچھ بھاری ہے!“ بھیا نے کہا اور کاغذ کی ایک جٹ لٹی سے جوڑ کر نیچے لٹکا دی اور پھر پوری جدوجہد سے اڑانے لگے۔ اس دفعہ پتنگ تھوڑی ہی دیر میں کافی اونچی ہو گئی۔ چرخی میرے ہاتھوں میں گھوم رہی تھی اور پتنگ کچھ جھٹکتی، لجاتی، شرماتی اور دوسری پتنگوں سے دامن بچاتی بلند ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے دو ایک بار نظر بھر کر اسے دیکھا ننھی سی پتنگ عروس نو کی طرح بار بار نیچے جھک رہی تھی اور بھیا ڈور ڈھیلی کر کے ہلکے جھٹکے سے اسے سیدھا کر لیتے اور وہ جھٹکا کھاتے ہی اس طرح سیدھی ہو جاتی۔ جیسے بے کس غریب امیروں کے ہر اشارے پر ناپتے پھریں۔ میرا دل ایک سانس دھڑکے کے جا رہا تھا۔ بھلا کوئی کیا جانے کہ اس پتنگ سے بھی زندگی کا کوئی حادثہ وابستہ ہو سکتا ہے۔ یوں تو انسان کی تخلیق ہی ایک حادثہ ہے۔ پھر کیوں نہ اس کی زندگی میں بھی خوشگوار یا ناخوشگوار حادثات رونما ہوتے ہیں۔ مجھے بھی اس وقت اپنی زندگی کا ایک دلشکن حادثہ یاد آ رہا تھا۔ جیسے میں اپنے دل و دماغ سے یکسر فراموش کر چکی تھی۔ چرخی میرے ہاتھوں میں گھوم رہی تھی اور بھیا کی صورت دھندلی ہوتی جا رہی تھی، میری آنکھوں کے سامنے؟

ہم نے سنا ہے شہلا تمہارے کوئی بھائی تبدیلی و ہوا کی غرض سے آئے ہوئے ہیں؟“ تسنیم نے پوچھا۔

”ہاں! آئے تو ہیں پیچارے۔ ان کے ابا نے انہیں یہاں اس لے بھیجا ہے کہ شاید ان کی سدا سنجیدگی سے سکڑے ہوئے ہونٹ

یہاں کی ہوا لگنے سے پھیلنے لگیں۔“

”کیوں سکڑے رہتے ہیں ان کے ہونٹ؟“ اس نے سرگوشی کے لہجے میں سوال کیا اور اس کی نگاہیں افروز کے کمرے کے

بھڑے ہوئے دروازے سے نکرا گئیں۔

”ارے بچاری کچھ فلسفی قسم کے واقع ہوئے ہیں اور اماں ابا بیٹے کی اس طویل خاموشی سے اکتا کر خون کے آنسو روتے ہیں! اور میری اماں کا تو خیال ہے افروز پر ضرور کوئی جنم آتا ہے۔“

”تب تو بڑے عجیب انسان ہیں۔“ اس نے کہا اور بار بار آنکھیںوں سے بند دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔

”تم تو آج افروز کے کمرے کی طرف اس طرح دیکھ رہی ہو کہ ان کے انخواہوں کا ڈر ہے اور نبوا اگر تلاش کئے گئے تو ملیں گی تمہاری گھر سے۔“ میں نے تسنیم کو ستانے کے لیے کہہ دیا۔

”ارے ہٹو! تم بھی ایسی باتیں کرتی ہو کہ بس! میں تو یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ ہماری شہلا کی جس کے ساتھ شادی ہونے والی ہے وہ ہے کیسا؟

”ہشت! خدا نہ کرے جو میرا پالا ایسے سے پڑے جو کسی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر شاید یہ سوچنے سے بھی نہ چوکتا ہو کہ کیا ان آنسو بھری آنکھوں میں کشتیاں چلائی جاسکتی ہیں اور جہاز چل سکتا ہے؟ میں نے جل کر کہا اور تسنیم نے ایک زور کا قہقہہ لگایا۔ وہ بھی اتنی زور سے کہ افروز ضرور کچھ سوچتے سوچتے چونک پڑے ہوں گے۔

”کہاں تک پڑھے ہیں وہ؟ تسنیم نے پوچھا۔

”ایم۔ اے تک!“

بند دروازے ہو لے سے چرچرائے اور افروز شاید مترنم قہقہہ لگانے والی کو دیکھنے کے لیے باہر نکل پڑے۔

”ہائے اللہ! تسنیم نے کہا اور جب افروز کو اچھی طرح دیکھ لیا تب دوپٹے سے منہ چھپا کر میرے پیچھے چھپ گئی۔

”کیا ہے افروز بھائی!“ میں نے ان کی اس حرکت سے کچھ ناگواری سی محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

”پانی چاہیے!“ انہوں نے کہا اور ان کی نگاہیں میرے عقب میں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔

”آپ اندر چلے میں ابھی پانی لاتی ہوں۔“ وہ مڑے اور تسنیم ان کو گھور گھور کر دیکھنے لگی۔ میں پانی لے کر اندر گئی تو وہ کچھ مضطرب سے بیٹھے ہوئے تھے۔

”معاف کرنا شہلا! مجھے معلوم نہ تھا کہ کوئی آیا ہوا ہے؟“ انہوں نے گلاس لیتے ہوئے کہا۔

”کوئی بات نہیں۔ وہ ابھی چلی جائیں گی۔ پھر آپ آزادی سے باہر نکل سکتے ہیں۔ گھر میں کھڑکی لگی ہے۔ اس لیے کبھی کبھی مجھ

سے ملنے چلی آتی ہیں!“

”پڑی غلطی ہوئی مجھ سے۔ ان سے معافی مانگ لینا میری طرف سے انہوں نے گلاس واپس کرتے ہوئے کہا اور جب میں باہر نکلی تو تسنیم دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہنس رہی تھی۔

”اب میں جا رہی ہوں شہلا! اماں آواز دے رہی تھیں۔“

”پھر آنا تسنیم! گھر میں کھڑکی ہوتے ہوئے بھی تم تو مہینوں منہ نہیں دکھاتی ہو۔“

”نہیں! اب آیا کروں گا شہلا!“

وہ مجھ سے لپٹ گئی اور پھر بھاگ کر کھڑکی میں گھس گئی۔ اس کے جانے کے بعد افروز باہر نکل کر ٹہلنے لگے۔ رات کو خلاف عادت ان کے سگڑے ہوئے ہونٹ دیر تک پھیلا گئے۔

دوسرے دن دوپہر کو خلاف امید تسنیم پھر نکلتی بل کھاتی میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اور میرے گلے میں باہیں ڈال کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ باتوں کے دوران میں اس کی نظریں بار بار افروز کے کمرے کے بند دروازے سے ٹکراتی رہیں اور نامعلوم کس خیال سے اس کا چہرہ لال بھجھوکا ہو جاتا۔ کپٹیاں دھک دھک کرتی اور آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے تیرنے لگتے۔ میں سوچنے لگی کہ ان گھر کی چہار دیواری میں بند رہنے والی بڑی کیوں کا بس خدا ہی حافظ ہے۔ مرد کے تصور ہی سے سرخ پڑ جاتی ہیں اور اگر ان کی طرف کوئی نظر بھر کر دیکھ لے تو کیا حال ہو؟“

”بہت خوش ہو تسنیم؟“ میں نے اس کا گلابی ہاتھ داب کر کہا۔

”تمہارے پاس رہ کر مجھے نامعلوم کیوں بے حد مسرت ہوتی ہے شہلا! اس نے مجھے اپنے سینے سے بھینچ لیا۔

”چھوڑ کم بخت!“ میں نے اس کی گردن میں زور سے چٹکی لے لی۔

”اوئی!“ وہ زور سے چیخی۔ بند دروازے پر چڑچڑائے اور افروز گھبرائے ہوئے باہر نکل آئے لیکن تسنیم کو بیٹھا دیکھ کر فوراً ہی مڑ گئے اور تسنیم چھپنے کی بجائے انہیں ایسی نظروں سے دیکھنے لگی جیسے اس کی آنکھیں افروز کے اٹھتے ہوئے قدموں کے نیچے پائمال ہونے کے لیے تڑپ رہی ہوں۔ آج مجھے نہ معلوم کیوں اس کا اس طرح دیکھنا بہت برا لگ رہا تھا اور تسنیم بات بات پر جھنکار دار قہقہے لگا رہی تھی جیسے وہ اپنی باریک آواز افروز کو سنار ہی ہو۔

”رشیدہ! اگر تمہاری شادی افروز سے ہو جائے تو کیسا ہے؟“

”ہشت! تجھے نہ بیاہ دوں؟“ میں نے کہا اور وہ کسمسا کر سرخ پڑ گئی۔ کہنے کو تو میں نے کہہ دیا کہ تجھے نہ بیاہ دوں لیکن دل ہی دل میں نہ جانے کس جذبے کے تحت ”خدا نہ کرے“ بھی کہہ دیا۔ ورنہ کل کی بات ہے کہ میں افروز کو صرف ایک فلسفی بدحوہ سمجھتی تھی لیکن اب ان کی وہی فلسفیانہ باتیں مجھے اپنی طرف کھینچنے لگی تھیں۔

”کہاں ہے تنسیم؟“ تنسیم کی ماں نے کھڑکی سے سر نکال کر چیخنا شروع کر دیا اور وہ بے تحاشا بھاگی۔ شام کو افروز اصرار کر کے مجھے اپنے ساتھ سینما دکھانے لے گئے۔ اس کے دوران وہ کچھ ایسی باتیں کرتے رہے جن سے لگاوٹ سی ظاہر ہوتی تھی۔ میں نے بھی ہزاروں امیدیں ان کی ذات سے وابستہ کر کے امیدوں کے قلعے کی بنیاد ڈال دی۔

افروز کو ہمارے ہاں رہتے ہوئے ایک ماہ ہو گیا۔ اس اثناء میں تنسیم برابر دوپہر کو آتی رہی۔ وہی نیچی نیچی نگاہیں بند دروازوں سے ٹکراتی رہیں اور مترنم قہقہے دوپہر کے سنائے میں گونجتے رہے کبھی کبھی افروز اور تنسیم کی مٹھ بھیل بھی ہو جاتی۔ افروز کی دلچسپیاں مجھ سے بڑھتی گئیں اور میں امیدوں کے قلعے کی رکھی ہوئی بنیاد پر سنہرے خوابوں کے اینٹ گارے سے ایک شاندار محل بنانے میں مصروف رہی۔ لیکن اکثر میرے قلعے کی بنیاد اس خیال سے ٹک لکڑہ جاتیں کہ چند دن بعد افروز چلے جائیں گے۔ پھر میں کیا کروں گی؟ لیکن تھوڑی دیر بعد وہی سنہرے خواب اور میں!

دوپہر کا سناٹا! اماں کے تیز خراٹوں کی آواز میرے کمرے تک آ رہی تھی۔ سامنے کے کمرے میں لیٹے ہوئے افروز کے بار بار کروٹیں بدلنے سے کپڑوں کی سرسراہٹ ہوا میں تیز ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میں چپ لیٹی خیالات کی نفرتی زنجیروں کی کڑیاں جوڑ رہی تھی۔ لیکن خراٹے اور سرسراہٹ کڑیاں ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئیں۔ میرے سرہانے چرچر ہوئی اور میں نے سر اٹھا کر دیکھا تنسیم کھڑکی سے جھانک رہی تھی۔

”آؤ نا!“ میں نے کہا اور اس نے اپنا گداز جسم چھوٹی سی کھڑکی میں ٹھونس دیا۔ اور دھم سے گری۔

”کیوں چپ پڑی ہو شہلا؟“

”دل گھبرا رہا تھا!“

”اماں سوئی ہی نہ تھیں جو آتی۔“ وہ میرے پاس لیٹ گئی اور کھسر پھسر کر کے محلے کی خبریں سنانے لگی۔ لیکن نگاہیں بار بار افروز کے کمرے سے بند دروازوں سے ٹکراتی رہیں اور بات بات پر چھوٹے چھوٹے قہقہے لگا رہی تھی۔

”اب افروز چلے جائیں گے؟“ میں نے اس کی بے چین نگاہیں تاڑتے ہوئے کہا۔

اکیلے تھوڑا ہی جائیں گے تمہارا خیال بھی تو ساتھ ہوگا؟ وہ ایک کھیانی سی ہنسی ہنس رہی تھی۔

ارے ہٹو! میں اس کھیلاہٹ سے کھکھلا کر ہنس دی اور پھر اٹھ کر کونٹھے پر کتاب لینے چلی گئی تاکہ تسنیم سے پڑھواؤں اور خود ٹھاٹ سے سنوں۔ میری آنکھوں میں کچھ درد سا ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب کتاب لے کر نیچے اتری تو صحن میں کسی کے دبے دبے قدموں سے بھاگ کر دم سے تخت پر بیٹھنے کی آواز نے مجھے چونکا دیا اور میں تیزی سے سڑھیاں طے کر کے نیچے پہنچ گئی۔

دیکھا کہ تسنیم کی سانس پھولی ہوئی ہے اور افروز کے کمرے کا دروازہ آدھا کھلا ہوا ہے۔ میں سمجھ گئی کہ یہ ساری شرارت ان بی تسنیم کی ہے۔ میں نے اچھٹی ہوئی نظر افروز پر ڈالی وہ بے خبر سوئے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ میں جا کر تسنیم کے پاس بیٹھ گئی۔ لیکن سیدھے منہ بات نہ کی۔ وہ میرے کڑے تیور دیکھ کر زیادہ نہ بیٹھی۔ اور پھر آنے کا وعدہ کرتی ہوئی چلی گئی۔ لیکن چلتے چلتے آدھ کھلے دروازے کی طرف دیکھ کر اس طرح ہنسی کہ مجھے یقین ہونے لگا کہ افروز جاگ رہے ہیں اور انہیں کو دیکھ کر یہ ہنسی ہے۔ میں دبے قدموں جا کر دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو گئی اور اندر جھانکی لیکن وہ کروٹ لیے پڑے تھے اس لیے کچھ نہ سمجھ سکی۔ پھر بھی نہ معلوم میرا دل کیوں ان کی طرف سے بالکل صاف ہو گیا اور میں ساری دوپہر تسنیم کے متعلق سوچ کرتاؤں کھاتی رہی اور جب شام کو میں نے افروز کو دیکھا تو کچھ رنجیدہ سے ہو رہے تھے۔ مجھے گھومنے چلنے کی دعوت دی لیکن میں نے انکار کر دیا وہ اور بھی رنجیدہ ہو کر تنہا ہی چلے گئے۔ پھر جب تھوڑی دیر بعد واپس آئے تو میں یہ دیکھ کر بیساختہ بہنس دی کہ ان کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی ہری پتنگ ہوا کے ننھے تھینروں سے کانپ رہی تھی۔

شاید تم اس لیے ہنس رہی ہو کہ میرے جیسے سنجیدہ انسان کو یہ پتنگ اڑانے کا شوق کیوں کر ہوا۔ تمہارے خیال سے تو مجھے صرف ہاکی فٹ بال اور ٹینس وغیرہ کھیلنا چاہیے۔ اور اگر یہ پتنگ اڑاؤں گا تو ایک ان پڑھ سا چھوکرہ معلوم ہوں گا کیوں؟“ وہ پتنگ میں کئے باندھتے ہوئے کہنے لگے۔

”نہیں! یہ بات تو نہیں ہے لیکن۔۔۔۔۔“

”تو پھر چلو بھی کوٹھے پر ورنہ چرخی کون پکڑے گا؟“

”چلیے!“ میں نے چرخی اٹھالی۔ اماں نکلیوں سے اپنے بھانجے کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔ ان کے خیال میں اب افروز کا جن بغیر کسی عمل کے اتر گیا تھا کوٹھے پر جا کر میں چرخی پکڑ کر ایک طرف بیٹھ گئی اور وہ جھٹکے دے دے کر اسے اڑانے لگے لیکن وہ بڑھنے کی بجائے زمین پر گر کر پھٹ گئی۔ انہوں نے لٹی سے اسے جوڑتے ہوئے کہا۔

اندر بے چین تھی کہ کوئی راجہ اندر داخل ہو کر رانی کو گلے سے لگا لے۔

”اب۔۔۔۔۔!“ وہ پھر آہستہ آہستہ کہنے لگے۔ چند دن بعد میں یہاں سے چلا جاؤں گا اور پھر کسی کے جھٹکتے ہوئے قہقہے ویران دو پہر میں چاندنی راتیں نہ بنا سکیں گے وہ حسین لمبی آنکھوں والا چہرہ مجھے دیکھ کر دوپٹے میں نہ چھپ سکے گا اور وہ لچکتے ہوئے جسم کو سنبھالنے والے چھوٹے چھوٹے پاؤں کبھی کبھی مجھ سے ملنے کی تمنا میں چپکے چپکے میرے کمرے کی طرف نہ بڑھ سکیں گے۔ اور کسی کے بھاری قدموں کی چاپ انہیں بھاگ جانے پر مجبور کر سکے گی۔ مجھ سے ملے بغیراف۔۔۔۔۔ نہ جانے وہ سیاہ آنکھیں اور کانپتے ہوئے ہونٹ نامعلوم مجھے کیا کچھ کہنے والے تھے۔ لیکن“

وہ ایک دم محویت سے چونک پڑے اور مجھے گہری گہری نگاہوں سے گھورنے لگے۔ میرا سر چکرار ہا تھا اور میری امیدوں کے قلعے کی بنیادیں لرز رہی تھیں۔ کھلے ہوئے پھاٹک بند ہو گئے۔ بھٹکے ہوئے راجہ کے لیے رانی سو گوار تھی۔

”شہلا! اس وقت مجھے ایک افسانے کا پلاٹ یاد آ رہا تھا اور ارے تم کو یہ کیا ہوگا ہے۔ چرخی ٹھیک سے پکڑو رنڈور ٹوٹ جائے گی۔“ اور پھر یہ پتنگ امیدوں کے قلعے کی طرح نامعلوم کہاں گر جائے۔“ میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ امیدوں کا قلعہ پل بھر میں گر کر ویرانہ ہو گیا۔ رانی کے منہ سے ایک سسکی دم توڑتی ہوئی نکل گئی۔ کھوٹی ہوئی چرخی میری مٹھیوں میں بھنچ گئی۔

”شہلا! یہ کیا کیا تم نے؟“ بھیا کی کرخت آواز نے مجھے چونکا دیا۔ افروز کی شبیہ ایک دم غائب ہو گئی۔

”چرخی داب کرڈور توڑ دی۔“ وہ مجھے تیز نظروں سے گھور رہے تھے۔ کتنے ارمان سے آج پتنگ اڑانے چلا تھا۔ وہ بھی تم سے نہ دیکھی گئی آخر میں پوچھتا ہوں کہ تم کو ہو کیا گیا تھا؟“

”کچھ نہیں بھیا! آپ دوسری پتنگ منگا لیجئے۔ بھولے سے چرخی دب گئی۔“ میں نے کہا لیکن وہ برابر گھورے جارہے تھے۔ میں ان کی نگاہوں سے بچنے کے لئے چرخی پھینک کر نیچے بھاگ گئی اور تکیے میں منہ چھپا کر پڑ رہی۔



اب تم جا سکتے ہو

”کون؟“ عالیہ دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سے چونک پڑی اور رو حیلہ بھی کھانا پکانے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
”میں ہوں شوکت!“

”ارے تم ہو!“ عالیہ رو حیلہ کو شہیک سے دوپٹہ اوڑھنے کی ہدایت کرتی ہوئی دروازے کی طرف بھاگی۔

”آتے کیوں نہیں اندر؟“ عالیہ نے کہا اور جیسے ہی شوکت اندر داخل ہوا عالیہ اسے دیکھ کر جھجک گئی۔ شوکت اس کی نظروں کے سامنے اب تک وہ گودوں کا کھلایا ہوا دس گیارہ سال کا بچہ تھا جو اس کی بزرگی کا خیال نہ کرتے ہوئے اپنی حد سے بڑھی ہوئی شرارتوں سے اسے تنگ کیا کرتا تھا اور اب وہی شریر دبلا پتلا لڑکا ایک خوبصورت تندرست نوجوان کے روپ میں اس کی نگاہوں کو دھوکا دے رہا تھا۔

”عالیہ آ پا! آپ تو مجھے اس طرح دیکھ رہی ہیں جیسے پہچانتی ہی نہیں۔“ شوکت نے سوٹ کیس رکھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔
”کتنے تو بڑے ہو گئے ہو تم۔“ عالیہ نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھ کر کہا۔

”اگر میرے بڑے ہونے سے آپ کا دل دکھا ہو تو میں پھر چھوٹا ہو جاؤں۔“ شوکت نے ہنس کر کہا اس کی شریر آنکھیں باورچی خانے میں بیٹھی ہوئی رو حیلہ کا تعاقب کر رہی تھیں۔

”ابھی تک تمہاری شرارت نہیں گئی، اور ہاں یہ تو بتاؤ کہ اتنے عرصہ بعد کیوں بھول پڑے؟“

”بھول کیوں نہ پڑتا آپ کی یاد ہی بڑی ستارہ تھی۔“

”جھوٹے!“ عالیہ ہنس پڑی۔

”سچ عالیہ آ پا! آپ کو نہ بھلا سکا۔ بھلا آپ بھی کوئی بھلائی جانے والی چیز ہیں؟“

”شریر!“ عالیہ نے کہا۔ لیکن اسے شوکت کے کہے ہوئے بولنا معلوم کیوں بڑے بیٹھے معلوم ہوئے شاید اس لیے کہ اس نے اس سے پہلے ایسی باتیں سنی ہی نہ تھیں۔

”اور عالیہ آ پا وہ کون ہے؟“ شوکت نے جھپنی ہوئی روحیلہ کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ میری بڑی مرحوم بیٹی کی نشانی ہے جیسے میں اپنے خون کے چھینٹے دے کر پال رہی ہوں۔ تاکہ میرے بڑھاپے کا سہارا بن کر مجھے دنیا کی ٹھوکروں سے بچا سکے۔ شاید تم نے اسے بچپن میں دیکھا ہوگا۔ جب یہ دو سال کی تھی۔

”آپ نے سب کچھ بتا دیا لیکن میں تو صرف نام پوچھنا چاہتا تھا؟“

”اوہ! اس کا نام روحیلہ ہے، بس اب تو کچھ نہیں پوچھنا چاہتے۔“

”نہیں بھئی! لیکن عالیہ آپالڑکی تو بہت ہی سعادت مند معلوم ہوتی ہے دیکھیے نا کیسی سر جھکائے کام کر رہی ہے؟“ شوکت نے

بیباکی سے اس کی طرف دیکھا اور وہ شرمناک سرخ پڑ گئی۔

”ہاں عالیہ آپا! بتائیے کہ آپ نے اپنا ارادہ بدلا یا نہیں؟“

”کون سا ارادہ شوکت؟“

”وہی شادی کرنے کا؟“ شوکت شرارت سے عالیہ کے چہرے کو دیکھا۔

”شوکت! بیٹی ہوئی باتوں کو نہ یاد دلاؤ۔ تم جانتے ہو کہ مجھے بچپن ہی سے مردوں کی صورت سے نفرت رہی ہے۔ میری نظروں

کے سامنے آج تک اس بیکس عورت کی زندگی آ جاتی ہے جس کے شوہر نے ذرا سے ٹک کی وجہ سے اسے قبل از وقت سسکا سسکا کر مار

ڈالا اور پھر اب تو بڑھا پا گیا۔ جب جوانی میں اپنا ارادہ نہ بدلا تو بڑھاپے میں شادی کرنے کی تمنا عبث ہے۔“ عالیہ کچھ رنجیدہ سی ہو

گئی اور اپنی بڑی بڑی بے رونق آنکھیں زمین پر گاڑ دیں۔

”میں کہتا ہوں عالیہ آپا کہ آخر آپ کو ابھی سے اپنے بڑھاپے کا احساس کیوں ہو رہا ہے؟ میری آنکھیں تو آپ کو ابھی بھی اسی

حالت میں دیکھ رہی ہیں جب آپ میرے ساتھ رہتی تھیں۔ یقین کیجئے عالیہ آپا آپ کی آنکھوں میں تارے بھرے ہوئے معلوم

ہوتے ہیں۔“ شوکت نے ایسے کہا۔ جیسے وہ حرف بحرف سچ بول رہا ہو۔ عالیہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ تم بہت شریر ہو شوکت!“

”یہ شرارت نہیں حقیقت ہے۔ جس سے آپ جان بوجھ کر گریز کر رہی ہیں۔ لیکن میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ جو کوئی آپ کا

شریک زندگی بنے گا یقیناً خوش قسمت ہوگا۔“ شوکت نے عالیہ کی نظریں بچا کر روحیلہ کو دیکھا اور اسے اپنے بدن میں چپوئیاں سی

رینگتی ہوئی معلوم ہونے لگیں اور عالیہ نے محسوس کیا کہ اس کا دل بیٹھا جا رہا ہے جس وجہ اس کو خود بھی سمجھ میں نہ آئی کہ آخر کیوں؟ اب

سے چند سال پہلے اسے شادی کرنے کے لیے خاندان میں سب ہی نے سمجھا یا تھا۔ لیکن اس پر کسی کی باتوں کا اثر نہ ہوا اور وہ اپنی

بڑھتی ہوئی نفرت کو کسی طرح نہ دبا سکی لیکن آج اس کے گودوں پالے ہوئے چچا زاد بھائی کی باتیں اس کا دل دھڑکا رہی تھیں۔

”عالیہ آ پا! آپ تو مزے سے چپ بیٹھی ہیں، یعنی کے مجھے کھانے پلانے کا ارادہ نہیں اور یہ روحیلہ تو میری طرف سے ایسی بے خبر ہیں جیسے کہ ہم ان کے گھر آئے ہی نہیں۔ سچ عالیہ آ پا اگر آپ نے مجھے کھانے پینے کو نہ پوچھا تو کیا ہوا۔ پھر بھی میں آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں ایسا معلوم ہو رہا کہ میری خزاں رسیدہ زندگی میں بہار آ گئی۔“ شوکت نے آخری بات روحیلہ کو آنکھوں کے گوشے سے دیکھ کر کہی اور اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ شوکت کی نگاہوں سے بچنے کے لیے سکر کر بیٹھ رہی۔

”ابھی لاتی ہوں شوکت! باتوں باتوں میں کچھ یاد نہ رہا۔“ عالیہ شوکت کے میٹھے بول اپنے دھڑکتے ہوئے دل میں چھپا کر کھڑی ہو گئی۔ ”اس سے مل کر شوکت کی زندگی میں بہار آ گئی۔“ یہ سوچ کر بار بار عالیہ خوشی سے جھومنے لگتی اور اس کے چہرے پر پڑی ہوئی ہلکی ہلکی سلوٹیں تنے لگتیں۔

”روحیلہ! تم شوکت کے ہاتھ دھلاؤ۔“ عالیہ نے کھانا کشتی میں لگاتے ہوئے کہا اور روحیلہ لوٹے میں پانی لے کر شوکت کے پاس گئی تو شرم سے پسینے پسینے ہو رہی تھی۔ ایک تو اس نے اپنے ہوش میں شاید کسی مرد کو دیکھا ہو اور عالیہ سے بھلا ملتا جلتا بھی کون تھا۔ شادی نہ کرنے کی وجہ سے سب ہی ناراض تھے پھر بھلا روحیلہ مردوں کی گرم گرم نگاہوں سے کیسے واقف ہو سکتی تھی۔

”اپنے ہاتھ سے میرے ہاتھ دھلاؤ۔“ شوکت نے شرارت سے سے دیکھا اور وہ تھر تھر کانپنے لگی۔ خوف سے اس کی آنکھیں ساکت ہو رہی تھیں۔

”ارے تم تو ڈری جاتی ہو روحیلہ! یعنی کہ تم کو میں ہڑپ ہی تو کر جاؤنگا یہ عالیہ آ پا جو ہیں نامردوں کی دشمن! انہیں کاسا یہ تم پر پڑ گیا ہے۔ اگر میں نے بھی عالیہ آ پا کو نیچا نہ دکھایا ہو تب کی بات۔“ وہ مسکرا کر اسے دیکھنے لگا اور وہ لوٹا رکھ کر باورچی خانے میں بھاگ گئی۔ ”ہائے ہائے کیا مزے کا کھانا پکا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ ہاتھ چوم لوں آ پا آپ کے۔“ شوکت نے بڑا سناوالہ بے صبروں کی طرح ٹھونستے ہوئے عالیہ کو دیکھا اور وہ سرخ پڑ گئی۔

”شریر! میں نے نہیں پکا یا۔“ عالیہ نے کہا۔

”کسی نے بھی پکا یا ہو میں تو آپ ہی کو سب باتوں کا بانی سمجھتا ہوں۔“ اس نے آنکھوں کو نیچا کر کہا۔ عالیہ کی میلی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہو رہی تھی۔

”ہائے اللہ! شوکت تم کبھی سنجیدہ نہ ہو گے؟“

”کبھی نہیں!“ وہ برابر نوالے لٹھونے جارہا تھا۔ عالیہ اسے بھوکے بنگالی کی طرح کھانے پر ٹونادیکھ کر مسکرا رہی تھی اور معصوم روحیلہ دور بیٹھی خوفزدہ نگاہوں سے شوکت کو دیکھ رہی تھی۔

شوکت بہ سلسلہ ملازمت یہاں آیا ہوا تھا۔ ٹھہرنے کے لیے اس سے زیادہ اچھی جگہ اور کیا ہو سکتی تھی۔ جہاں روحیلہ جیسی پیارے حسن کی مالک اس کے دھڑکتے ہوئے دل اور پیاسی آنکھوں کے لیے تسکین بنی ہوئی تھی اور پھر عالیہ شوکت کے لیے اس کا کنوارا بڑھاپا خاصا تفریح کا سامان پیدا کر دیتا۔ اس کا دل بس یہ ہی چاہتا تھا کہ کسی طرح عالیہ کو کبھی نہ آنے والے حسن اور جوانی کا یقین دلا کر کسی بوڑھے کو گودا باد کرے اور بیچارے بڑھے تو اس موقع کی تلاش میں رہتے ہیں کہ کچھ تو باتھ آئے پھر شوکت کو اپنا ارادہ پورا کرنے میں کون سی مشکل پیش آتی۔ ساتھ ہی وہ اس خیال سے غافل نہ تھا کہ روحیلہ کو اپنا بنانا ہے ورنہ چند سالوں کے بعد اس غریب پھر بھی کنوارا بڑھاپا نہ اترنے والے بھوت کی طرح سوار ہونے لگے گا اور سچ تو یہ کہ شوکت کو روحیلہ سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ عالیہ کی آنکھ بچا بچا کر اس کو خوب دیکھتا اور باتیں عالیہ سے کرتا جاتا اور عالیہ تھی کہ ہر طرف سے بے خبر ہو کر شوکت کے پاس بیٹھی رہتی۔ اس نے میڈیکل سرٹیفکیٹ داخل کر کے اسکول سے دو ماہ کی چھٹی لے لی۔ حالانکہ وہ ملازمت سے اس طرح چھٹی لے کر گھر بیٹھنا ہمیشہ برا سمجھتی تھی لیکن اب تو شاید شوکت نے ہر بری بات کو اچھا کر دیا تھا۔ پہلے تو یہ بھی تھا کہ وہ کبھی ٹھاٹھاٹ نہ کرتی تھی لیکن اب گھنٹوں آئینہ کے سامنے کھڑی پوڈر سے اپنے چہرے کی سلوٹیں چھپانے کی کوشش کیا کرتی۔ ساڑھی میں شکن پڑی اور اس نے دوسری پہنی۔ پھر بھی پلپلا جسم اچھانہ لگتا تھا۔ ذرا ساری کھسکی اور تھلتھلاتی ہوئی باہیں کھل گئیں وہ اب خود کو سب کچھ کرتی لیکن غریب روحیلہ کی آفت آ گئی تھی۔

دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھ کنگھی روز روز کرنے کی ضرورت نہیں یہ اچھل اچھل کر کیوں چلتی ہے؟ سر کھلا ہے حرامزادی کا۔“ ہر وقت یہی باتیں روحیلہ کے پلے پڑتی تھیں۔ جیسے اس سے سخت خطرہ تھا۔ اور بڑی بوڑھیاں تو لڑکیوں کو خطرناک قسم کے خطرے کی نشانی سمجھا ہی کرتی ہیں۔

”کتنی اچھی لگتی ہو عالیہ آپا!“ جب عالیہ صبح سنگھار کر کے کمرے سے نکلتی تو شوکت کہتا۔

”آنکھوں میں تو جیسے تارے بھرے ہیں آپ کی!“

”بالکل رانی معلوم ہوتی ہیں کاش کسی کے دل کی ملکہ بننا پسند کرتیں۔“

”شریر!“ ان تمام باتوں کے جواب میں کہتی اور چہرہ لال بھسوکا ہو جاتا آنکھوں میں لال ڈورے تیرنے لگتے اور کنپٹیاں

پھڑپھڑانے لگتیں۔ روحیلہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے بڑھی گھوڑی لال لگام کو دیکھا کرتی اور کچھ نہ سمجھتی یہ سب ہے کیا...؟

روحیلہ لحاف میں سکڑی بے خبر سو رہی تھی اور اس کے قریب دوسرے پلنگ پر پڑی ہوئی عالیہ کروٹیں بدل رہی تھی اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کسی نے بستر پر بہت سی سوئیاں ڈال دی ہیں جو اس کے بدن میں چبھی جاتی ہیں۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کاش یہ چھپتی ہوئی سوئیاں کوئی نکال ڈالے۔

رات کے بارہ بج گئے لیکن نیند اس سے کوسوں دور تھی۔ اب اسے یہ خیال ستا رہا تھا کہ اگر شوکت چند دن بعد چلا گیا تو کیا ہوگا؟ یہ گھر پھر ویران ہو جائے گا۔ اس کی پھڑکتی ہوئی روح پر خاموشی طاری ہو جائے گی اور ملے ہوئے کمرے سے شوکت کے گانے کی آواز آئی۔ ”اے کاش وہ آجائیں ایسا بھی تو ہوتا ہے۔“ عالیہ بے چین ہو گئی شوکت اسی کو بلا رہا ہے اس خیال سے اس پر دیوانگی سی چھانے لگی وہ دبے قدموں اٹھ کر شوکت کے کمرے کی طرف چلی آج وہ نہ جانے کیا کچھ کہہ دینا چاہتی تھی۔

”آپ!“

”ہاں!“ وہ اس کے سر ہانے کھڑی ہو گئی اور مونے مونے آنسو شوکت کے چہرے پر گرنے لگے۔

”کیوں رو رہی ہیں عالیہ آپ؟“ شوکت نے اسے حیرت سے دیکھا تاہم ایک رات اور تنہائی پھر عالیہ کی عجیب سی آنکھیں۔

”عالیہ آپ....“ ”نہیں صرف عالیہ کہ شوکت!“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

شوکت کا دماغ جھنا گیا۔ وہ بھلا کیا جانتا تھا کہ اگر سوئے ہوئے کو جگا دو تو منہ دھلوانے کی تمنا بھی اسی سے کی جائے گی وہ تو صرف ایک بڑھے کی ویران گود کو آباد کرنے کے خواب دیکھتا کرتا تھا۔

”میرا دنیا میں کوئی بھی نہیں زندگی کے اتنے بہت سے سال گزار دیئے۔ لیکن کسی کو اپنا نہ بنا کسی۔“ عالیہ کے منہ سے ایک سسکی نکل گئی۔

”تو آپ فکر کیوں کرتی ہیں عالیہ آپ۔ ماں کی محبت سے عرصہ ہوا محروم ہو چکا ہوں آخراہ کیوں نہ آپ کی خدمت کر کے اپنی ماں کی یاد تازہ کر لوں۔“

”ماں!“ عالیہ کی آنکھیں ساکت ہو گئیں۔

”ہاں ماں! کیا آپ مجھے اپنا بیٹا نہ سمجھیں گی؟“ شوکت نے جلدی سے کہا کیونکہ وہ سمجھ رہا تھا کہ معاملہ اب حد سے بڑھ چکا ہے۔ عالیہ نے اپنا سر ہاتھوں سے تھام لیا۔ اس کا دل چوٹ کھا گیا تھا۔ عالیہ کی حالت دیکھ کر شوکت کی آنکھیں بھی بھرا آئیں خود بھی تو چوٹ

کھائے ہوئے تھا۔

”اب تم کیوں روتے ہو؟ میرا تو آج رونے کو دل ہی چاہ رہا تھا۔“

”عالیہ آ پا! میری زندگی ویران ہو رہی ہے۔“

”تو وہ کیونکر آباد ہو سکتی ہے؟“ عالیہ نے بے چین ہو کر پوچھا۔ وہ اپنی زندگی کی ویرانی کو تو دور نہ کر سکی لیکن شوکت کے لیے سب کچھ کر کے ایک بار اپنی محبت کو تسکین دینا چاہتی تھی۔

”مجھے روحیلہ سے محبت ہے۔ اسے میرا بنادیتے۔“

”روحیلہ!“ وہ شوکت کو گھورنے لگی۔ اسے پہلے ہی روحیلہ کی طرف سے خطرہ تھا۔

”کل تم دونوں کا نکاح کر دوں گی لیکن ایک شرط!“

”کوئی شرط؟“

”جب تک میں اجازت نہ دوں تم دونوں کو میرے ہی پاس نہ رہنا ہوگا!“

”مجھے منظور ہے!“ اس نے انتہائی جوش میں کہہ دیا۔

”اچھا تو پھر صبح۔۔۔“ وہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی اور اپنے بستر پر گر کر سسکیاں بھرنے لگی۔ اس نے اپنی زندگی کے

خوبصورت ایام بیجا نفرت میں گزار دیئے اور اب جوانی کو بڑھاپے سے محبت کرتے دیکھنا چاہتی تھی۔ شوکت کا کیا قصور؟

اس نے وعدے کے مطابق شادی کر دی لیکن خود دوسروں کی زندگی آباد کر کے ویران ہو گئی تھی۔ محبت کی ناکا کی نے اسے چڑھا دیا تھا۔ وہ جس وقت روحیلہ اور شوکت کو دیکھتی تو غم و غصے سے جل اٹھتی۔

”روحیلہ! تم اب بالکل ہاتھ سے نکلی جا رہی ہو آخر یہ گھر کا کام کون کرے گا اور شوکت تم وقت پر دفتر نہیں جاتے اگر لگائی

ملازمت چھٹ گئی تو کیا ہوگا؟“ وہ دونوں الگ الگ ہو بیٹھے اور وہ ان کی وقتی علیحدگی سے کچھ مطمئن سی ہو جاتی لیکن شوکت اور روحیلہ عالیہ کی ان باتوں سے تنگ آ رہے تھے۔

”عالیہ خالہ تو ہم کو خوش دیکھ کر انگاروں پر لوٹے لگتی ہیں۔“ روحیلہ کہتی۔

”نہ معلوم یہ بڑھے اپنی طرح سے بچوں کو بھی کیوں روتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔“ شوکت کہتا لیکن وہ کیا جانتا تھا کہ عالیہ کے دل

کی کیا حالت ہے اسے تو اب یاد بھی نہ رہا تھا کہ کبھی اس نے عالیہ کو اپنے مذاق کا نشانہ بنایا تھا۔ لیکن عالیہ پھر بھی شوکت کو اپنی آنکھوں

سے اوجھل نہ ہونے دینا چاہتی تھی۔

رات کو ایک دم سے بادل آ گئے اور رات بڑی سونی سونی معلوم ہونے لگی۔ عالیہ اپنے کمرے میں تنہا پڑی بے چین سی ہو رہی تھی۔ کاش اس کے پاس بھی کوئی ہوتا جو اس کے بازو سہلا سہلا کر اس اچھی طرح باتیں کرتا۔ ملے ہوئے کمرے سے روحیلہ اور شوکت کے ہنس ہنس کر باتیں کرنے کی آواز آئی۔ عالیہ کو ایسا محسوس ہوا کہ کسی نے اس کو پلنگ سے اٹھا کر نیچے پنچ دیا۔ وہ جھنجھلا کر زور سے چیخی۔ ”آخر تم لوگ کب تک جاگو گے۔ میری تو راتوں کی نیندیں حرام ہو گئی ہیں۔“ آواز آنا بند ہو گئیں اور وہ کچھ مطمئن سی ہو گئی اور سوچنے لگی کہ یہ اسے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ وہ ان کو کسی طرح خوش نہیں دیکھ سکتی۔ جب وہ دونوں باتیں کرتے ہیں تو اس کا دم کیوں گھٹنے لگتا ہے؟ خدا یا وہ اپنی زندگی کیسے کاٹے۔ وہ انہیں اپنی آنکھوں کے سامنے سے ہٹا بھی نہیں سکتی۔ زندگی کا آخری سہارا بھی ٹوٹ جائے گا۔ لیکن اب وہ ان سے جلتی ہی کیوں ہے۔ آخر وہ یہ کیوں چاہتی ہے کہ جوانی بڑھاپے کا ساتھ دے اور نیند نے اسے دبوج لیا۔ رات بھر تیز بارش ہوتی رہی۔

”شوکت! اگر تم کہیں جانا چاہتے ہو تو جا سکتے ہو۔“ عالیہ نے منہ نہ کھلا۔ اس کی آواز میں دکھ ہی دکھ بھرا تھا۔

”عالیہ! پا! وطن میں ایک دوست نے ملازمت کا ٹھیکہ کر لیا ہے۔ کاش! آپ واقعی جانے کی اجازت دے سکتیں۔“

”ہاں! میں واقعی تم کو اجازت دے رہی ہوں۔“

”لیکن آپ کی وہ شرط!“ شوکت نے آنکھیں پھاڑ کر کہا اسے یقین ہی نہ آتا تھا کہ کبھی عالیہ اپنے قیدیوں کو رہائی بھی دے گی۔

”وہ شرط پہلے تھی اب نہیں ہے!“ عالیہ نے اپنا منہ پھیر لیا۔

”سچ عالیہ! پا!“

”ہاں! اب تم جا سکتے ہو۔“ عالیہ کا چہرہ فرط غم سے سفید ہو رہا تھا۔ اس نے خود ہی اپنا سہارا بھی کھو دیا۔ روحیلہ خوشی سے مسکرا رہی تھی۔

اب روز روز کی پابندیوں کا خاتمہ تو ہوا۔ عالیہ کپڑے تبدیل کر کے سکول چلی گئی۔ آج اس کی چھٹیاں ختم ہو گئی تھیں۔

عالیہ بلیک بورڈ پر لکھ کر بچوں کو انگریزی لکھنا بتا رہی تھی۔ لیکن اس کا دماغ کسی اور ہی طرف تھا۔ کچھ کھوئی کھوئی سی۔ اب تم جا سکتے

ہو۔ انگریزی لکھتے لکھتے اس نے یہ لکھنا شروع کر دیا۔ اب تم جا سکتے ہو۔ بچیوں نے زور سے پڑھا اور ان کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا کہ

سب کیا ہے۔



دھکا

”بابو جی!“

”ہاں!“ اس نے نظر اٹھائی ایک سہمی سی لڑکی اس کے پاس کھڑی تھی۔ جانے کیا کچھ کہنے کے لیے اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔

”بہت غریب ہوں بابو جی! اگر کچھ کام کاج ہوا کرے تو مجھ سے کرا لیا کرو۔ بوڑھے دادا کی آنکھیں جاتی رہیں۔ کوئی روٹی کا دینے والا نہیں۔ ماں باپ کب کے خدا کو پیارے ہوئے۔“

”تو میں کیا کروں!“ وہ اپنے گرد آلود خشک بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

”چودھری جی کہتے تھے کہ تمہارے گھر میں کوئی کھانا پکانے والا نہیں مجھے رکھ لو جو سمجھ میں آئے دے دیا کرنا۔“ وہ اس کا ایسا خشک سا جواب سن کر اسے خوف سے دیکھ رہی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ کیوں نہ اسے کام کرنے پر رکھ لیا جائے۔ دن بھر کا تھکا مٹا چولہے ہانڈی میں سرکھپاتا ہے آرام تو مل جائے گیا لیکن تنخواہ صرف بیس روپے ہے۔ باپ کو خرچ بھیجنا اپنا پورا کرنا۔ پھر اس کو کہاں سے دے گا اور ابھی تو اسے اپنی شادی کے لیے بھی کچھ جمع کرنا ہے۔ کوئی یوں تو اپنی لڑکی دینے سے رہا۔

”بابو جی! چکی پیس کر کچھ پیسے مل جاتے ہیں جو دادا اسی کو پورے نہیں پڑتے۔“ وہ اسے اپنی پتا سنا کر موم کرنا چاہتی تھی۔

”تمہارے دادا کا پیٹ نہیں بھرتا میں کیا کروں؟“ وہ چڑ رہا تھا۔ وہ خود نوکر تھا اور غریب پھر کسی کو کیسے نوکر رکھتا۔ وہ چودھری کبھت گاؤں کا سب سے موٹا تو ندیل کتا کیوں نہیں رکھ لیتا اسے نہ جانے کس دن کے لیے یہ دولت جمع کر رہا ہے۔

”بابو جی!“ لڑکی کی آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے۔ وہ نامعلوم کیا سوچ کر دل ہی دل میں اپنی تنخواہ کا حساب کرنے لگا۔ پانچ روپے ماہانہ باپ کو بھیج دیا کرے گا۔ دس روپے میں اپنا پورا کرے گا۔ پانچ روپے شادی کے نام سے بچا لیا کرے گا۔ اور پھر اسے کیا دے گا؟ کیا یہ صرف کھانے پر رہ جائے گی۔

”کیا لوگی تم؟“

”بس بابو جی! پیٹ بھرنے کو دو وقت کچھل جایا کرے تمہاری ساری خدمت کروں گی۔“
 ”توکل سے روٹی پکا دیا کرنا۔“

”اچھا بابو جی!“ وہ جیسے خوشی سے جھومی جا رہی تھی۔ اب وہ کام سے لگ گئی ہے اسے گاؤں کے آوارہ لونڈے اور وہ موٹے موٹے تو ندیل بڑھے نہ ستائیں۔ وہ دن بھر یہاں کام کرے گی۔ شام اپنے جھونپڑے میں دادا کے پلنگ سے پلنگ بھڑا کر سو رہے گی لیکن ٹھنڈے بندھے ان کی وہاں بھی رات گئے اسے چپکے چپکے سہلانے پہنچ جاتے ہیں۔ اب تو وہ رات کو بھی ان بابو جی کے گھر ہی رہ جایا کرے گی۔ کتنے شریف ہیں جب سے آئے ہیں کسی کی بہو بیٹی کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ لڑکی نے ذرا ہی دیر میں بہت سے منصوبے گانٹھ لیے۔

دوسرے دن اس نے گھر کا سب کام سنبھال لیا۔ گھر کی ہر چیز تہیوں کے مال کی طرح تڑی بڑی ہو رہی تھی۔ عالی نے سارا دن سخت محنت کر کے ہر چیز سلیقے سے رکھ دی اور شام کو جب قاسم گردے لتھڑا ہوا گھر آیا تو وہ اسے دادا طلب لگا ہوں سے دیکھنے لگی۔ لیکن اس نے کوئی خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ اور آخروہ اپنی خوشی کا اظہار کسی کی محنت دیکھ کر کیوں کرتا۔ دنیا نے اس کی سخت تر محنتوں کی داد کب دی۔ وہ دن بھی تھے جب اس نے میٹرک پاس کرنے میں اپنی ماں کے سب زیورات فروخت کر دیئے تھے۔ انتہائی مصیبتوں کا مقابلہ کیا تھا صرف اس امید پر کہ اسے ایک اچھی سی ملازمت مل جائے گی۔ پھر اس کے سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ انگریز کے راج میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھلا کون بیکار پھر سکتا ہے۔ لیکن اسے کیسی ناکامی ہوئی۔ امتحان کی کامیابی کے بعد پورے تین سال تک مارا مارا پھرا۔ وہ غریب کیا جانتا تھا کہ انگریز کے راج میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ ایک مزدور سے بھی گیا گزرا ہو جائے گا۔ کہاں کہاں نہ پھرانو کری کے لیے۔ لیکن جواب میں بھائی جگہ نہیں ہے پھر بھی کوشش کروں گا۔“ یعنی کے وہ ایک بھکاری تھا کہ آگے بڑھو بابا پھر پھیرا لگاتا۔ بعض لوگ تو اس سے خوف کھانے لگے تھے کہ وہ کہیں نوکری کے لیے نہ کہ دے۔ جیسے کہ وہ امتحان کی کامیابی کے بعد ایک خطرناک مجرم تھا۔ جس سے لوگ کتراتے۔ پھر بڑی مشکلوں سے اسے نوکری ملی تھی تو پترولی کی جگہ شہر کا پروردہ دیہات کی ویرانی اسے کھانے کو دوڑتی اس کا دل چاہتا کہ کہیں بھاگ جائے، لیکن کہاں؟ وہ اپنی بیکسی پر جھلا اٹھتا۔ موت بھی نہیں آتی اسے آپ ہی آپ چڑچڑانے لگتا۔ پھر بھلا وہ کسی کی محنت دیکھ کر کیوں تعریف کرتا۔ اسے تو اب بات بات پر جھلانا آ گیا تھا۔ تنہائی اور ویرانی، غریب کی کتنی عجیب سی زندگی تھی۔

عالی کو کام کرتے ہوئے بہت دن ہو گئے۔ اندھے دادا کی دیکھ بھال کرنے کے بعد اسے جتنا وقت ملتا قاسم کی خدمت میں گزار

دیتی۔ اسے اب باہر نکلتے ہوئے تو جیسے ڈر سا معلوم ہوتا تھا۔ اپنا گھر بھلا اب اور اب اس نے تو بالکل قاسم کے گھر کو اپنا گھر سمجھ لیا تھا لیکن یہ بات نہ تھی کہ وہ قاسم کو گھر والا بھی سمجھ بیٹھی ہو۔

یہ ضرور تھا کہ وہ ایک گھر والی کی طرح قاسم کی ہر تکلیف پر کراہ اٹھتی، لیکن قاسم تھا کہ سرشام منہ لپیٹ کر پڑ رہتا اور عالی رات گئے تک بیٹھی اونگھا کرتی کہیں اسے کام نہ ہو۔

”کوئی کام تو نہیں بابو جی؟“ وہ سونے سے پہلے پوچھتی اور جب کوئی جواب نہ ملتا تو سو جاتی اور خواب میں بھی قاسم کا پریشان چہرہ دیکھا کرتی بیچاری اس کے خیال سے گھلی جا رہی تھی لیکن قاسم اسے بات بات پر جھڑکیاں دیتا رہتا۔

”چائے میں اتنی شکر کیوں ڈالی ہے؟“ وہ چیخ پڑا۔

”یہ دال پکائی ہے اتنا زیادہ گھی ڈالا ہے جیسے تیرے باپ کی کمائی ہے۔“ وہ خواخواہ اسے ڈانٹتا اور عالی چھوٹی بچیوں کی طرح بسورنے لگتی۔ ایک دن قاسم کو نہ جانے کیا جھک سوار ہوئی کہ خوب ہی عالی کو باتیں سنائیں۔ غریب سہم کر خوب روئی اور اس کے پاؤں پکڑ لیے۔

بیچاری وہاں سے ہٹ کر جاتی بھی کہاں اسے تو گاؤں کے لونڈوں کی الٹی پلٹ آنکھوں سے ہی جوڑی آتی تھی۔ پاؤں پکڑنے کے بعد قاسم ایک دم رحم دل ہو گیا۔ جیسے عالی نے پاؤں پکڑنے کی بجائے اس کا دل پکڑ لیا ہو۔

جب وہ تھکن سے چور سرشام ہی بستر پر پڑ رہتا تو چراغ کی مدھم سی روشنی میں اسے کوٹھڑی ایک قبر معلوم ہوتی جس میں وہ اپنی راتیں گزارنے پر مجبور تھا۔ تنہائی میں رہ کر اس کا دم گھٹنے لگتا تو وہ پریشان ہو کر عالی کو آواز دیتا تا کہ کچھ باتیں کر کے دل بہلائے۔

اب تو وہ خود بھی عالی سے مانوس ہوتا جا رہا تھا۔

”کوئی کام ہے بابو جی؟“

”ہاں! پانی پلا دو۔“ وہ کہتا۔ حالانکہ اسے اس وقت ذرا بھی پیاس نہ لگی ہوتی۔

”بابو جی اور کوئی کام؟“ وہ گلاس لے کر پوچھتی۔

”نہیں!“ اس کے منہ سے نکل جاتا اور وہ چلی جاتی۔ تنہائی پھر وہی کھا جانے والی بھیا نک تنہائی چراغ کی مدھم سی لومیں اسے اپنی تمنائیں بھڑکتی ہوئی معلوم ہوتیں۔ عالی اور تنہائی اس کے جسم میں چیونٹیاں سی ریگنے لگتیں۔

”عالی!“ وہ پھر عالی کو آواز دیتا۔

”ہاں بابو جی!“ وہ آٹے سے لتھڑے ہوئے ہاتھ لیے آ جاتی۔

”کھانا تیار ہو گیا؟“ وہ یوں ہی پوچھ بیٹھتا۔ حالانکہ وہ نہ جانے کیا کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کچھ بھی نہ کہہ سکتا تھا۔ اسے تو اگر ڈر لگتا تھا تو صرف بدنامی سے پھر تھا بھی بزدل۔ ناکامیاں تو بزدل بنا ہی دیتی ہیں۔

”عالی سرد در در رہا ہے۔“

”دبا دوں بابو جی؟“

”نہیں! ہاں! اچھا دبا ہی دو۔“ وہ ہمت کر کے کہتا اور وہ ہاتھ صاف کر کے اس کا سر ہولے ہولے دبانے لگتی۔ اور وہ ایک عجیب سا سرد محسوس کرتے ہوئے ٹھنڈی سانسیں بھرا کرتا۔

عالی سمجھتی کہ بابو جی کو گھریا دیا رہا ہے تبھی یہ اس میں بھری جا رہی ہیں۔ بھلا وہ کیا جانتی تھی کہ گاؤں کے آوارہ لونڈوں کی گرم تیز تیز سانسوں میں سے سانس لینے کی ایک پہ بھی قسم ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی بزدل سانسیں جیسے وہ کرنا بہت کچھ چاہتا ہے لیکن کر نہیں سکتا۔

”بس اب مت دباؤ۔“ وہ گھبرا کر کہتا۔ کیونکہ اس کا سینہ پھولتے پھولتے پھٹنے لگتا۔ وہ چلی جاتی اور قاسم پھر تنہا بھٹھکانے لگتا۔ اچھی طرح دھوپ پھیل چکی تھی لیکن قاسم آج اٹھنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ عالی اس کے یوں خلاف معمول پڑے رہنے سے پریشان ہو رہی تھی اور بار بار بند کو ٹھنڈی کے دروازوں کے چکر لگاتی۔ کہیں طبیعت خراب نہ ہو، اس خیال سے وہ کانپ اٹھتی۔ بیچارے بابو کا یہاں کون بیٹھا ہے جو خبر لے گا۔ اچھے رہیں! اس کی بھی روٹی کا سہارا ہیں اور پھر جس دن سے وہ یہاں رہنے لگی ہے سب نے اسے چھیڑنا بھی چھوڑ دیا ہے۔

”عالی!“

”ہاں بابو جی!“ وہ دوڑتی ہوئی اندر آ گئی۔ قاسم بھلا چنگا معلوم ہو رہا تھا عالی کی آنکھیں خوشی سے ناچنے لگیں۔ لیکن قاسم اسے اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے بڑی بری سی خبر سنانا چاہتا ہو۔

”چائے لاؤں بابو جی؟“

”لے آؤ!“

وہ جلدی سے چائے لے آئی۔

”عالی! میری بدلی ہو گئی۔“ اس نے کہا۔ عالی کی ناچتی ہوئی آنکھیں ٹھہر گئیں۔

”میں کل بارہ بچے چلا جاؤں گا۔ دوسرا پترو لی آ گیا ہے۔“ ہو خاموش رہی آنکھوں میں آنسو ٹپ رہے تھے۔

”آج کیا پکاؤں بابو جی؟“ اس نے آنسو پی کر پوچھا۔

”کچھ نہیں آج میرے پاس بیٹھو۔ میرا سر دکھ رہا ہے۔“ وہ عالی کو گھور گھور کر دیکھنے لگا۔

”دبا دوں؟“

”ہاں!“

وہ سر ہانے نکل کر سرد ہانے لگی۔ ہائے اب بابو جی چلے جائیں گے اور پھر اسے سب ستائیں گے اور وہ تو ند پھلا چودھری تو اسے کھا ہی لے گا۔ کتنی بری آنکھوں سے اسے دیکھتا تھا۔

اب پھر وہ بھوک سے مجبور ہو کر سب کے آگے ہاتھ پھیلائے گی اور لوگ اس کے بدلے میں اس کے آگے ہاتھ پھیلائیں گے۔ یہ بابو جی کتنے شریف ہیں کبھی اسے بری نظر سے نہیں دیکھا۔

”عالی!“

”ہاں بابو جی!“ وہ اس پر جھک گئی۔ قاسم کی سانس پھول رہی تھی اور آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔

”ادھر بیٹھ جاؤ۔ یہاں بالکل میرے پاس۔“

وہ اس کے لیے رحم کا جذبہ ابھارے پہلو میں آ گئی۔ قاسم کے گرم گرم ہاتھ اور چمکی ہوئی سانسیں عالی کا جی بھی نہ جانے کیسا ہونے لگا۔ قاسم نے اس کا ہاتھ سینے پر رکھ لیا۔

”بابو جی!“ عالی کی آواز میں التجا تھی۔

”ہاں۔۔۔ آں ہاں۔ اوہ۔“ قاسم کی سانس اس طرح پھول رہی تھی کہ عالی ڈر گئی۔

”میں بھی چلوں گی تمہارے ساتھ بابو جی!“ عالی نے اپنا سرا اس کے سینے پر رکھ دیا۔

دس لفتگوں سے ایک بھلا مانس بہتر ہوتا ہے۔ عالی نے بھی دل میں ٹھان لی۔

”میرے ساتھ چلو گی۔“ قاسم کے ہاتھ سرد پڑ گئے اور آنکھیں حیرت سے ساکت ہو گئیں۔ اس نے عالی کو بازوؤں سے پکڑ کر

دھکا دے دیا۔ بیس روپے۔ صرف بیس روپے۔ وہ اسے کیونکر رکھے گا۔ عالی دھکا کھا کر رونے لگی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے

پچاسوں لٹی پٹی آنکھیں اسے پھاڑ کھانے کے لیے خوشی سے ناچ رہی تھیں۔



بگڑے کیسو

کمرے کے سب دروازے بند تھے اور باہر غضب کی بارش ہو رہی تھی۔ سنسناتی ہوئی ہوا بند دروازوں میں ٹکریں مار رہی تھی اور کمرے میں ایک عجیب اداسی سی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے اپنے جسم پر کمبل ڈال لیا۔ دروازے بند ہونے کے باوجود سردی سی محسوس ہو رہی تھی۔ کمرے کی اداسی اور سنسناتی ہوئی ہوا نہ معلوم کیوں میرا دل گھبرانے لگا۔ ایک طرف آپامنہ لٹکائے کرسی پر دراز کسی گہری فکر میں غرق تھیں۔ شاید دولہا بھائی کے متعلق سوچ رہی ہوگی کہ اس بارش میں دفتر سے کیسے آئیں گے اور ان باتوں کے سوا شادی شدہ عورت بھلا سوچ ہی کیا سکتی ہے۔ میں بارش رکنے کی دعا نہیں کرنے لگی تاکہ کہیں گھوم پھر آؤں۔ دل بے حد گھبرا رہا تھا پھر بمبئی کے ذرا سے کمرے اگر ایک دن بھی ٹھیلنے نہ جاؤ تو پیٹ کا برا حال ہو جائے۔ نہ تو بھوک ہی لگے اور نہ کھانا ہضم ہو۔ لیکن دولہا بھائی آئیں گے بھی تو تھکے ہوئے۔ بھلا مجھے کیوں لے جانے لگے۔ فوراً ہی خیال آیا کہ کاش اس وقت افروز آ جاتے تو معاملہ ٹھیک رہتا۔ آج سارے دن آئے بھی نہیں۔ بارش اب تھتھتے تھتھتے بالکل تھم گئی تھی۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور آپا نے اپنا لٹکا ہوا منہ اٹھا کر پوچھا۔

”کون ہے؟“

”ہوٹل کا بوائے!“

”آ جاؤ۔“ آپا نے کہا اور پھر منہ لٹکا دیا۔ میں چائے پینے کے خیال سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور دیکھا تو ہوٹل کے بوائے کے بجائے حضرت افروز گرم سیاہ سوٹ میں ملبوس کھڑے مسکرا رہے ہیں۔

”خوب!“ مجھے ان کے آواز بنا کر بولنے پر ہنسی آ رہی تھی۔

”کیوں جی یہ تم آوازیں بنا بنا کر ہم سب کو دھوکا کیوں دیتے ہو؟“ آپا نے کہا۔

”اور آپ دھوکے میں کیوں آتی ہیں۔“ وہ ٹھاٹ سے کرسی پر دراز ہو گئے۔

”سچ! میں ابھی آپ کو یاد کر رہی تھی۔“ میں نے کہا۔

”ہاں جب شیطان کو یاد کرو تو آ ہی دھمکتا ہے۔“

”اوں ہوں! جب رحمان کو یاد کرو تو آوازیں بناتا آ جاتا ہے۔“

وہ زور سے ہنسنے دیئے۔ اتنے میں واقعی بوائے چائے لے کر آ گیا مجھے ویسے ہی سردی لگ رہی تھی بغیر کسی کا انتظار کئے مزے سے چائے پینے لگی اور خیال یہ ستارہ تھا کہ اب افروز سے کیسے کہوں کہ مجھے ٹھنڈا لائیں۔

”کہو کوئی نیا افسانہ لکھا۔“ انہوں نے پوچھا۔

”ارے ہاں ایک بڑے مزے کا پلان سوچا ہے۔“

”کیا؟“

”ایک شریری لڑکی سب کے بال بگاڑا کرتی ہے جیسے اسے سنورے بالوں سے چڑھوا اور ایک دن وہ محسوس کرتی ہے کہ بال بال بگاڑتے بگاڑتے اس نے دل کی دنیا تباہ کر لی۔“

”اچھا ہاں! وہ لڑکی دہلی پتلی بھی ہوگی اور چشمہ بھی لگاتی ہوگی، کیوں؟“ افروز نے کہا اور آپا نے ایک قہقہہ لگایا۔ میں جل ہی تو گئی۔

”ارے خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کیا کیجئے۔ بھلا میں اپنے لیے کچھ توڑا ہی لکھ رہی ہوں یہ تو ایک فرضی قصہ ہوگا اور بس۔“ میں نے مسکین صورت بنا کر اپنی صفائی کے لیے کہا۔

”ہا! بیچاری کی صورت تو دیکھو افروز بالکل اتر کر رہ گئی۔“ آپا نے بھی افروز کا ساتھ دیا اور میں ان کی باتوں سے اس قدر تپتی کہ عینک آنکھوں سے نوچ کر میز پر پنک دی اور دل ہی دل میں خدا سے دعا کرنے لگی کہ اے رب تجھ میں بڑی طاقت ہے تو مجھے موٹا کر دے اور یہ چشمہ جو آنکھوں کے لیے مسلسل لعنت ہے کبھی لگانے کی ضرورت نہ پڑے۔ جسے دیکھو بنا رہا ہے جیسے کہ میں فیشن کے لیے لگاتی ہوں۔

”دیکھنا بیٹھی جل رہی ہے۔“ افروز نے مجھے چپ دیکھ کر کہا۔

”جلنے والی پر خدا کی مار۔“ میں نے ہنس کر کہا لیکن دل یہ ہی چارہ رہا تھا کہ اٹھ کر ذرا اپنے ہاتھوں کے جوہر ان لوگوں کو دکھا دوں۔ لیکن بزرگی آڑے آئی پھر بھی افروز کے بنے سنورے بال بگاڑنے کی دل میں ٹھان لی اور چپکے سے اٹھ کر افروز کی کرسی کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ ہاتھ آہستہ سے بڑھایا اور ان کے بال بگاڑ دیئے۔

”کیا مذاق کرتی ہے پگلی میرے بوڑھے بالوں سے۔“ انہوں نے میرے ہاتھ پکڑ لئے تاکہ پھر یہ حرکت نہ کر سکوں اور پھر کچھ

رنجیدہ سے ہو کر مجھے گہری گہری نگاہوں سے گھورنے لگے۔ انہیں رنجیدہ دیکھ کر مجھے ترس آ گیا۔ غریب کی زندگی بھی کتنی دردناک ہے۔ کوئی بھی سچا مانوس و غم خوار نہیں۔ بیوی تک صرف ان کے پیسے سے محبت کرتی ہے۔ بیچارے گھر سے بھاگ کر اپنا فالو وقت ہمارے ہاں گزارتے ہیں۔ چھوڑ دو جی میرے ہاتھ۔ ورنہ سارے بال آپ کی ہتھیلی پر نظر آئیں گے۔“ میں نے چڑ کر کہا اور جیسے ہی ہاتھ آزاد ہوئے آپا کے سر پر دست شفقت پھیرنے لگے۔

”ٹھہر تو کمینی!“ وہ بھی مجھ سے بھڑ گئیں۔ میں پنیرے بدل بدل کر اپنے ناتواں جسم کو بچا رہی تھی کہ دولہا بھائی بھیگے بیٹھے بٹیر بنے آ گئے۔ آپا نے نہال ہو کر مجھے بخش دیا اور اپنے لاڈلے شوہر کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”ہے ہے! غریب بھیگ گئے۔“ میں نے برا سامنے بنا کر دولہا بھائی کو دیکھا اور وہ میری اس شرارت پر صرف گھور کر چپ ہو رہے۔ بھابھی نے ان کے کپڑے تبدیل کروائے، چائے پلائی اور پھر ان کو آرام کرنے کا حکم سنا دیا۔ ان کی طبیعت بھیگنے کی وجہ سے کچھ بھاری ہو رہی تھی۔ اس لیے افراد بھی زیادہ نہ بیٹھے اور میرے سر پر ایک زوردار چیت رسید کرتے ہوئے کھسک گئے۔ آپا اور دولہا بھائی نے اپنی بزم خلوت کو رونق بخشی۔ رہ گئی میں گھوڑی، تو پچھلے سے نکلے میں منہ چھپا کر پڑ رہی اور ایسی حالت میں نہ معلوم کب سو گئی۔ بیٹھے بیٹھے خواب دکھائی دے رہے تھے۔ پھر صبح تڑکے ہی آنکھ کھل گئی۔ آیا اور دولہا بھائی کے خراٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ میں اپنے بکھرے بال درست کر کے چپ بیٹھ رہی۔ منہ کون دھوئے۔ سوچنے یہ گئی کہ ابھی چائے کی امید ایک گھنٹہ اور نہ کرنی چاہیے۔ سونے والے نہ معلوم کب بیدار ہوں۔ یہ بھی کوئی میں ہوں جو رات کے ایک دو بجے سوؤں اور پھر تڑکے اٹھ کر سوچوں کہ نیند کیوں رات بھر نہیں آتی۔ کیا ٹھٹھا دار زندگی ہے بس خدا کی مار ہے۔

”کیا سوچا جا رہا ہے فلسفی صاحب!“ دولہا بھائی نے اپنے خلوت کدے سے سر نکال کر مجھے دیکھا۔ جیسے کہ وہ میرے سوچنے پر طنز فرما رہے ہیں۔ میں نے ان کو کوئی جواب نہ دیا۔ آج نہ معلوم کیوں میرا دل نہ چاہا کہ دولہا بھائی کی طرف دیکھوں بھی۔ یہ وہی دولہا بھائی تو ہیں جو صرف بنانا اور مذاق کرنا جانتے ہیں۔ دوسروں کے جذبات کے ساتھ ہیما نہ سلوک کرتے ہیں۔ میں سر شام اپنے بستر پر گر کر کروٹیں بدلا کروں آپا اور دولہا بھائی مجھ سے دو باتیں بھی کریں۔ میں ہی بے غیرت ہوں جو سب کو چھیڑ چھیڑ کر باتیں کرنے پر مجبور کروں۔ ورنہ کس کو غرض پڑی ہے۔ جو میری دلجوئی کرے اور میں اپنی زندگی کی ان بے اعتدالیوں سے گھبرا کر پہروں منہ چھپائے رویا کروں۔ ایک افراد ہی ایسے ہیں جو ہر طرح میری دلجوئی کرتے ہیں۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آج مجھے شدت سے اپنی تھکی ہوئی زندگی کا خیال رنجیدہ کر رہا تھا۔ چائے پر دولہا بھائی مجھے رنجیدہ دیکھ کر پھبتیاں کسے لگ گئے۔ لیکن میں نے کوئی

جواب نہ دیا اور سارا دن انتہائی سکوت سے کٹ گیا بس یہ ہی سوچتی رہی کہ وہ زندگی بھی کیا زندگی ہے جو در ماندہ ہو۔ اور میں سب کچھ بھول بھال کر افرز کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔ یہ میرا روز کا معمول ہو کر رہ گیا تھا کہ ان کا بے چینی سے انتظار کیا کروں۔ جس دن وہ شام کو نہ آتے جیسے میرا دل گھبراتے گھبراتے ڈوبنے سا لگتا اور جب وہ دوسرے دن آتے تو میں بظاہر غصے سے برا سا منہ بنا کر ان سے بات نہ کرتی لیکن وہ مجھے تھپک تھپک کر منا لیتے اور میں من جاتی۔ خدا ہی جانے کیوں میں چند دن سے اپنے دل میں ان کے لیے ایک جگہ سی پار ہی تھی حالانکہ وہ مجھ سے بچوں کا سلوک کرتے تھے۔ رات کے آٹھ بج گئے اور وہ نہ آئے۔ اور یہاں تک کہ دس بج گئے۔ اب ان کے آنے کا قطعی امکان نہ تھا۔ میں دل ہی دل میں بیچ و تاب کھا رہی تھی اور جی چاہتا تھا کہ ابھی گھر سے نکل کھڑی ہوں اور جہاں بھی ان کے ملنے کا امکان ہو تلاش کروں اور پھر اتنے بال بگاڑوں کہ گھنٹوں نہ سلجھ سکیں۔ لیکن مجبوری خاموشی سے اپنے مونس و غمخوار بستر سے ہم آغوش ہو گئی لیٹے لیٹے وہی افروز کا خیال ان کی ہمدردیاں میرے لیے کتنی خطرناک ثابت ہو رہی تھیں۔

صبح سو کر ابھی تو واقعی اپنے کو بے حد رنجیدہ پایا۔ دل ہنسنے بولنے سے جیسے متنفر سا ہو رہا تھا۔ اسی حالت میں دن کٹ گیا اور خدا خدا کر کے شام آئی پھر انتظار تھا اور میں۔ لیکن زیادہ دیر نہ ہوئی آج وہ خلاف معمول جلد آ گئے۔ میں ایک دم خوش ہو گئی۔ بظاہر غصے سے منہ پھیر لیا۔

”ناراض ہو شہلا؟“ وہ میرے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

”ہٹے جی میں آپ سے نہیں بولنا چاہتی۔“ انہوں نے پیچھے سے آ کر میرے سر پر چاٹنا جھاڑ دیا۔ میں نے انہیں کوئی جواب نہ دیا اور سامنے پہاڑ کی چوٹی سے جھانکتے ہوئے چاند کو دیکھتی رہی۔ میں جانتی تھی کہ جب تک وہ مجھے منانہ لیں گے جا نہیں سکتے۔

”چلو شہلا تم کو گھملا لائیں دیکھو کتنی اچھی رات ہے۔“ وہ مجھے گھمانے کا لالچ دینے لگے۔

”میں نے کہہ دیا کہ آپ سے بولنا نہیں چاہتی۔“

”تو کیا تم مجھے رنجیدہ کر دو گی؟“ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے میرا سر پکڑ کر چہرہ اپنی طرف کر لیا۔ میں نے دیکھا کہ آج وہ خلاف معمول زیادہ رنجیدہ ہو رہے تھے۔

”میں من گئی!“ میں نے گھبرا کر کہہ دیا اور وہ ہنس پڑے۔

”شہلا! کیا تم میرے رنجیدہ ہونے سے پریشان ہوتی ہو؟“

”ہاں!“

”کیوں؟“

”مجھے اچھا نہیں لگتا۔“ وہ گہری نگاہوں سے چاند کو گھورنے لگے۔ ”چلو گھومنے۔“ انہوں نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔ جیسے وہ کسی گہری فکر میں تھے۔

”چلئے، لیکن یہ بتائیے کہ آپ روز آ یا کریں گے؟“

”ہاں! آ یا کروں گا۔“ انہوں نے میرا سراپے سینے سے لگا لیا۔

”آپا میں جارہی ہوں ٹھیلنے۔“ میں نے چلتے ہوئے کہا۔

”جلدی ہی آنا ورنہ شاید میں سو جاؤں۔“

”اچھا!“ میں ان کے ساتھ سیڑھیاں ملے کر کے ایک چوڑی سڑک پر ہوئی جس کے دونوں طرف خاموش درخت کھڑے ہوئے۔ راہ گیروں کو تک رہے تھے میں اور وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے جارہے تھے۔ مجھے ان کے ساتھ کہیں آنے جانے کی روک ٹوک نہ تھی۔ افرزدولہا بھائی کے عزیز ترین دوست تھے اور اپنے بھائی کی طرح عزیز رکھتے تھے۔

”ہم اس پہاڑی سے اس پہاڑ تک جائیں گے۔“ میں نے کہا۔

”لیکن تم تھک نہ جانا۔“

”ارے نہیں۔“ میں نے ذرا تیز چل کر اپنی طاقت کا مظاہرہ کر دیا۔ ”چھپی بڑی شہر ہو تم اگر گریں تو؟“ انہوں نے کہا اور میں واقعی ٹھوکر کھا کر زمین بوس ہونے لگی۔ لیکن انہوں نے پکڑ لیا اور میں کچھ شرمندہ سی ہو کر آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ وہ میری جھینپ کو محسوس نہ کرتے ہوئے گتھانے لگے۔

”وہ دیکھو شہلا!“ انہوں نے انگلی سے اشارہ کیا۔

”سبز روشنی!“ میں ان کی انگلی کی سیدھ پر دیکھنے لگی۔ درختوں کے جھنڈ میں ایک بنگلے کے دروازوں سے سبز روشنی نکل رہی تھی۔

”اور وہ دیکھو۔“

میں نے دیکھا کہ تناور درختوں کے پیچھے چھپا ہوا چاند پتوں کی آڑ سے اپنی سعائیں پھینک رہا ہے اور اسی وقت درخت پر کوئے پر پھڑ پھڑا رہے تھے میں کچھ سے چین سی ہو گئی اور ایک درخت کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ وہ بھی میرے پاس ہی کھڑے ہو کر سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ میں ان کی نظر میں دو سال کی بچی تھی۔

”تھک گئیں؟“

”نہیں!“

”آخر تم یہ کئی کئی دن تک کنگھی کیوں نہیں کرتی ہو؟“

”نہیں کرتی، بال میرے خراب ہوں گے یا آپ کے۔“

”بڑی نامعقول ہو۔“ وہ ہنس دیتے اور میرا دل ڈوبا سا جا رہا تھا۔ اس وقت میں شدت سے محسوس کر رہی تھی کہ مجھے افروز سے

محبت ہے۔ میں دیر تک گرم سم کھڑی رہی اور پھر ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔

”آج کل کھانے کی بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔ وہ اپنے میکے میں چلی گئیں اور میں ہوٹل کے کھانے سے عاجز ہو رہا ہوں۔ کوئی

ملازمہ ہی نہیں ملتی۔ جو کھانا پکا سکے۔“ انہوں نے بھی میرے قریب دوسرے پتھر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”مجھے نوکر رکھ لیجئے۔“ میں نے کہا۔

”ہشت! کچھ پاگل ہو گئی ہے۔“

آپ مذاق سمجھ رہے ہیں۔ واقعی بغیر تنخواہ کے آپ کا سب کام کر دوں گی۔“

”پاگل اتنی گری ہوئی باتیں نہیں کرتے۔“

”نہیں سہی!“ میں چپ ہو کر چاند کی سیسلیں کرنوں میں اپنی اندھیری دنیا کا اجالا تلاش کرنے لگی۔

”تو پھر آپ مجھے نہ رکھیں گے نوکر؟“ میں نے پھر یوں ہی کہہ دیا۔

”نہیں!“

”کیوں؟“

”مجھے اپنے آنے والے بڑھاپے کا احساس ہے اس لیے میں خود غرض نہیں بننا چاہتا۔“ انہوں نے انتہائی سنجیدگی سے کہا اور جیسے

میرا دل دھک سے ہو گیا۔ یعنی کہ افروز میرے دل کی کیفیت سے واقف ہیں۔ اس انکشاف پر میرا دل چاہا کہ خوب روؤں لیکن آنسو

پی کر رہ گئی اور سر جھکا کر زمین پر کریدنے لگی۔

”یوں نہیں بیٹھتے سراو پراٹھاؤ۔“ انہوں نے میرا منہ اپنی طرف کر لیا اور باوجود ضبط کے میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

”کیوں روتی ہو مجھے بتاؤ میری دوست؟“ وہ واقف ہوتے ہوئے بھی انجان بن رہے تھے۔

”کچھ نہیں۔“

”بتا دو شہلا بی! آخر تم کیوں روئیں؟“

”کوئی بات نہیں!“

”کوئی بات نہیں پھر یہ رونا کیسا۔ میں نے اکثر محسوس کیا ہے تمہاری پلکیں آنسوؤں سے بوجھل ہو رہی ہیں اور تمہارے ہونٹ کچھ کہہ دینے کے لیے بیتاب ہو رہے ہیں۔ آخر یہ سب کس لیے؟“

”کیا بتاؤں آپ کو۔“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”وہ جس کے کہنے کے لیے تمہارے ہونٹ میرے سامنے لرزنے لگتے ہیں۔ انہوں نے مجھے شانے سے پکڑ کر جھوڑ ڈالا۔“

”مجھے اپنے پاس رکھ لیجئے۔“ نہ معلوم کیوں میرے منہ سے ایسا خستہ نکل گیا اور ساتھ ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”آخر میری ہمدردیوں نے تمہیں ایک غلط راستے پر لگا دیا۔ مجھے یہ سب پہلے ہی معلوم تھا۔ میں بھی چند دن تک تمہاری طرح ایک غلط راستے پر بھٹکا پھرا ہوں۔ لیکن اب میں اپنے لیے نہیں تمہارے لیے بڑی مشکلوں سے اپنے کو صحیح راستے پر لگا سکا ہوں۔ شہلا تم بھی زندگی کی ان الجھنوں میں گرفتار ہو کر اپنی زندگی نہ برباد کرو۔ فدا سوچو تو۔ بیس سال گزرنے کے بعد میرا کیا ہوگا؟ ضعیفی اٹھنے بیٹھنے سے بھی مجبور کر دے گی اور پھر بھیا تک موت تم سے مجھ کو چھڑا لے گی۔ بتاؤ کیا تم اتنی جلدی اپنی چوڑیاں توڑنے پر راضی ہو جاؤ گی۔ تم بچی ہو اپنی زندگی ہنس کھیل کر گزارو۔“ ان کی آواز بھرا گئی اور انہوں نے میری طرف سے منہ پھیر لیا۔ میں بھلا ان سے کیا کہتی بھلا وہ کیا جانیں کہ بھٹکے ہوئے راہی کو اسی بھٹکنے ہی میں مزا آتا ہے اور وہ ایک دن پر بیچ راستوں میں پھرتے پھرتے تھک کر ایک دائمی نیند سو جائے گا۔

”چلو شہلا! اب رات بہت ہو گئی۔“ میرا ہاتھ تھام کر کھڑے ہو گئے نہ معلوم کیوں میرے آنسو رکتے ہی نہ تھے۔

”کیوں روتی ہو پاگل۔ کیا دنیا کو ہنسنے کا موقع دو گی؟“

”نہیں!“

”پھر اپنے آنسو پونچھ ڈالو۔“

میں نے آنسو خشک کر لیے اور تھکے ہوئے مسافروں کی طرح گھر آ کر پڑ رہی۔ رات بھر نیند نہ آئی اور جب صبح اٹھی تو رونے اور جاگنے سے آنکھیں پھولی ہوئی تھیں جسم بری طرح ٹوٹ رہا تھا۔ تین چار پیالیاں چائے کی پینے کے بعد ذرا طبیعت درست ہوئی تو دولہا بھائی نے چھیڑنا شروع کر دیا۔

”یہ ہم کے گولے سیلے ہوئے سے کیوں ہو رہے ہیں؟“

”آپ کے فراق میں رات بھر روئی تھی۔“ میں نے چڑ کر کہا اور بھاگ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

شام کو انتظار کیا لیکن افروز نہ آئے یہاں تک کہ کئی دن گزر گئے اور میری بے چینی بڑھتی گئی۔ خدا خدا کرے وہ ایک صبح آ گئے۔ میں انہیں دیکھ کر جیسے اپنے سارے غم بھول گئی۔

”کہو تم نے اپنا افسانہ لکھ لیا۔“ انہوں نے آتے ہی مجھے اپنے پاس بٹھا کر پوچھا۔

”ہاں!“

”کون سا؟“

”وہ بال بگاڑتے بگاڑتے اپنی زندگی تباہ کر لی۔“ وہ مجھے گہری نظروں سے گھورنے لگے۔

”انجام کیا نکالا؟“ وہ میرے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

”ایک مسلسل اضطراب! میں نے کہا اور دل کے پھولے ہوئے پھولوں کا رستا ہوا پانی آنکھوں کی راہ بہہ نکلا۔ وہ نہ معلوم کیوں مجھے چپ نہ کرا سکا میں نے جلدی سے اپنے آنسو خشک کر لیے اور افروز کے بال بگاڑ کر زور سے ہنسنے لگی وہ بالکل سنجیدہ بیٹھے میری آنکھوں کے خلا میں کچھ تلاش کر رہے تھے۔ میں برابر ہنسنے لگی لیکن کوئی کیا جانے کہ بعض وقت گونجتے ہوئے قہقہوں میں سسکیاں دہی ہوتی ہیں۔ گونجتے ہوئے قہقہے سب سنتے ہیں اور دہی سسکیاں؟ وہ کوئی نہیں سنتا۔

میں تھکی سی پر دراز ہو گئی اور نہ معلوم کیوں دل چاہ رہا تھا کہ سرے سے سب کے بال اٹھیز کر ہاتھوں پر رکھ دوں۔



نہ جاؤ

جاڑوں کی طویل سردرات، آسمان پر سیاہ مہیب بادل چھائے ہوئے تھے اور تیز و تند ہوا بند دروازوں کو کھٹکھٹا کر ایک ہولناک طوفان کی آمد کا اعلان کر رہی تھی۔ کچھار میں چھپے ہوئے شیروں کی طرح بادل گرج رہے تھے۔ لیکن صفیہ اس طوفان سے بے خبر اپنی زندگی میں آنے والے طوفان کے خیال سے زرد ہو رہی تھی۔ اس کے سامنے اس کا قریب المرگ شوہر پڑا آخری سانس پوری کر رہا تھا۔ صفیہ کچھ بے خود ہی اس کے سر ہانے کھڑی آئینہ خان میں دھکتے ہوئے سرخ انگاروں کو گھور رہی تھی اور پلنگ کے نزدیک کھڑے ہوئے ملازمین اپنے آقا کو حسرت ناک نگاہوں سے تاک رہے تھے۔ کمرے میں آہیں اور سسکیاں بے چین ہو رہی تھیں اور باہر تیز ہوا غصے میں پھری اپنی تیز سانسوں سے دنیا کو روٹی کے گالوں کی طرح اڑا دینا چاہتی تھی۔ مریض کی حالت ہر لمحہ گر رہی تھی اور دیکھنے والوں کی آنکھوں میں آنسوؤں کے ان گنت چشمے پھوٹ نکلنے کے لیے بیتاب ہو رہے تھے۔ جانے والے کے لب تھر تھرائے اور صفیہ اس کی آخری باتیں سننے کے لیے اس پر جھک گئی۔

”صفو! ایک ڈوبتی ہوئی آواز اور صفیہ کے کلیجے کو پار کر گئی۔

”ہاں! کہو میرے محبوب!“ اس کی آواز گھٹ رہی۔

”میرے بعد شادی کر لینا۔ افسوس میں تمہارا ساتھ نہ دے سکا۔ لیکن تم کیا جانو کہ تمہیں چھوڑنے میں مجھے کتنا دکھ ہو رہا ہے اور.....“ اس کی آواز گلے میں پھنس گئی۔

”میں تم سے وعدہ کرتی ہوں تم یقین کرو کہ تمہارے بعد مجھے کوئی اپنا نہ سکے گا۔“

صفیہ نے محبت کے امنڈتے ہوئے جذبات کی رو میں کہہ دیا اور اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر رونے لگی۔ بچھڑنے والا اسے اپنی سفید پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا اور ایک تلخ مسکراہٹ اس کے پھیکے لبوں پر کانپنے لگی۔ ایسی مسکراہٹ جو کہہ رہی ہو کہ جوانی کی بھیاں تک تنہائیاں ایک دن اپنے وعدے کو بھلا کر دنیا کی حسین رنگینیوں کی طرح کھینچ جائیں گی اور پھر یہ زمین کی گہرائیوں میں چھپ جانے والا تم کو بھی تمہارا وعدہ یاد دلانے نہ آ سکے گا۔

صفیہ نے اپنی سسکیوں پر قابو پاتے ہوئے چہرے سے ہاتھ ہٹائے تو وہ تنہا ہو چکی تھی اس کے منہ سے ایک لرزتی ہوئی چیخ نکل گئی۔ آتش دان سے ایک سرخ شعلہ بلند ہو کر غائب ہو گیا۔ جیسے وہ بلند شعلہ کہہ رہا ہو کہ دیکھو موت کا خوفناک ہاتھ یوں ہی چپکے سے دراز ہو کر غائب ہو جایا کرتا ہے صفیہ اپنے شوہر کے سرد سینے پر جھک گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے جسم کی ساری گرمی اس کے سرد سینے میں سمو کر ایک بار پھر زندگی کی روح پھونک دے گی۔ ملازم اپنی مالکہ کو اس قدر بے خود دیکھ کر کمرے سے نکل گئے۔ رات بھر زوروں کی بارش رہی اور صبح آسمان پر ایک بھی بادل کا ٹکڑا نہ تھا۔ سورج کی سنہری کرنیں نکھرے ہوئے آسمان پر چمکتے ہوئے راستے بنا رہی تھیں لیکن صفیہ کی زندگی میں ایک ویران اندھیرا ہو چکا تھا۔ جہاں وہ سنہری کرنیں اپنا ایک راستہ بھی نہ بنا سکتی تھیں۔

دو سال بیت گئے کہ صفیہ اپنی تمام خوشیوں کو اپنے شوہر کے ساتھ زمین کے ایک ٹکڑے میں دفن کر چکی تھی اور اب دینا میں صرف آنسو بہانے کے لیے ایک خاموش اور سو گوار زندگی گزار رہی تھی اسے یقین ہو چکا تھا کہ محبت ایک رنگین خواب ہے جس کی کوئی تعبیر نہیں۔ راحت و مسرت ایک شاعرانہ تصور ہے جس کا کہیں وجود نہیں، شعر و موسیقی، حسن و شباب ایک انسانی واہمہ اور ایک مہمل تخیل ہیں۔ ورنہ دنیا آنسوؤں کا ایک دھارا ہے جو آہوں کی سرسراہٹ میں بہتا رہتا ہے۔ وہ اب سب کچھ بھول چکی تھی اور اس کی نظروں کے سامنے صرف اس کے شوہر کا مرجھایا ہوا چہرہ رہتا جسے وہ اپنے گرم آنسوؤں سے دھویا کرتی۔

ابھی اس کی آنکھوں کے آنسو بھی خشک نہ ہوئے تھے اور غم و اندوہ کے زخم مندمل نہ ہونے پائے تھے کہ اسے پھر وہ آنکھیں نظر آئیں جن میں اس کے لئے مسرت و محبت تھی اور وہ ان آنکھوں کو دیکھتی اور پہچاننے کی کوشش نہ کرتی۔ عورت اگر خود چوکنانہ چاہے تو وہ ان آنکھوں کو پہچاننے میں کبھی غلطی نہیں کرتی جن میں اس کے لیے محبت یا نفرت ہو لیکن صفیہ اپنے آپ کو فریب دیتی رہی وہ ان آنکھوں سے کتراتے رہی۔ اس نے اپنے احساس کے اس صحیح فیصلہ کو تسلیم نہ کیا کہ واصل کی بامعنی نگاہیں محبت کی پیامبر ہیں۔

واصل اس کی نصف کوٹھی میں بحیثیت کرایہ دار رہتا تھا وہ ایک نوجوان بیرسٹر تھا جس کی پریکٹس ابتدائی مراحل طے کر رہی تھی۔ اس کا مستقبل روشن تھا لیکن حال ہی میں کوئی رعنائی اور کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ہمیشہ ناکامیوں اور زندگی کی پر مشقت جدوجہد نے اس اتھڑائے عمر کے برخلاف سنجیدہ اور بردبار بنا دیا تھا۔ اس پر اکثر قنوطیت طاری رہتی تھی اور زندگی کے ہر سو گوار پہلو کو عمیق نظروں سے دیکھنا اس کی عادت بن گئی تھی اس نے اکثر تنہائیوں میں صفیہ کی بے کیف زندگی کے متعلق سوچا تھا اور اس کی سو گوار زندگی کا برابر سے شریک ہو جانا چاہتا تھا اور ساتھ ہی اس کا یہ خیال پختہ ہو جاتا تھا کہ صفیہ کے لیے اس سے زیادہ بہتر شریک حیات کوئی دوسرا ثابت نہ ہو سکے گا۔ چنانچہ وہ انہی جذبات کے تحت صفیہ کو محبت کے حسین اشارے پیش کرتا رہا اور وہ انہیں سمجھنے سے گریز کرتی رہی۔

ایک مغموم سی رات 'صفیہ کوٹھی سے کچھ دور ٹپلتے ٹپلتے تھک کر ایک درخت کے سہارے بیٹھ گئی۔ چاند کی مدھم سی روشنی میں اس کا حسن جگمگا رہا تھا لیکن حسن سوار تھا وہ اداس تھی کہ اچانک اس کا وہ ساتھی اس سے بچھڑ جائے گا جس کی محبت میں مہینوں آنسو بہانے کے بعد اس نے اس کو حاصل کیا تھا صفیہ نے اپنا جھکا ہوا سراو پر اٹھایا اور چاند کے نور میں کچھ تلاش کرنے لگی۔ جیسے کہ اسے امید تھی کہ کوئی آسمان کی انتہائی بلندیوں سے زمین پر پھیلی ہوئی چاند کی سنہری کمندوں کے سہارے چپکے چپکے اس کے پاس آ کر اس کی زندگی کو ایک بار پھر رنگین بنا دے گا۔

”صفیہ!“ کسی نے پیچھے سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا۔

”کون؟ آپ یہاں کیوں تشریف لائے؟“ اس نے سختی سے کہا۔ واصف سر جھکائے کھڑ رہا اور صفیہ کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

”میں کیوں آیا۔“ یہ خود بھی معلوم نہیں۔ لیکن صفیہ یہ تو بتاؤ کہ ایک مرے ہوئے انسان کے لیے زندگی برباد کرنا کہاں کی دانائی ہے۔ تمہارا شوہر تمہاری آہ و زاری سے بے خبر ہے، وہ تمہاری کوئی آواز نہیں سنتا۔ پھر تم اپنی زندگی برباد کرنے کی کوشش کیوں کر رہی ہو۔“ واصف کی آواز بھرا رہی تھی صفیہ کا دل کانپ گیا۔ وہ واصف سے بچنا چاہتی تھی لیکن اس وقت وہ اس کے سامنے کھڑ اپنی ساری محبت صفیہ کی آنکھوں میں منتقل کر دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

”آپ کو میرے نجی معاملات میں دخل دینے کا کیا حق ہے؟“

”کوئی حق نہیں! لیکن صفیہ میں تم کو تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ میں تمہاری آہوں کو قہقہوں میں تبدیل کر دوں گا۔ تمہارے غموں کو خوشیوں سے بدل دوں گا۔ دیکھو کہیں مجھے ٹھکرانہ دینا، تم سب کچھ جانتی ہو میری زندگی برباد کرنے کی کوشش نہ کرنا صفو!“ واصف نے اس کے بازو تھام لیے صفیہ کے سوائے ہوئے جذبات انگڑیاں لیتے ہوئے جاگ اٹھے۔ وہ بہک گئی اور اپنا سر واصف کے سینے سے لگا کر گرم ہو گئی۔ خوشیاں اس کے سامنے ناچ رہی تھی اور وہ واصف کی گہری گہری نگاہوں میں اپنی زندگی کا سکون تلاش کرنے لگی۔ معا اسے اپنے شوہر کا مرجھایا ہوا زرد چہرہ ہوا میں تیرتا ہوا نظر آیا جس کے پھیکے لبوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ کانپ رہی تھی ایسی مسکراہٹ جو کہہ رہی ہو کہ آخر جو انی بھیا نک تنہائیوں سے گھبرا کر دنیا کی رنگینیوں کی طرف بھاگنے ہی لگی۔

صفیہ نے اپنے لب بھینچ لیے اور واصف کا ہاتھ جھٹک کر الگ کھڑی ہو گئی۔

”واصف! میں مثل سراب ہوں جس کی طرف دوڑنے والا کچھ بھی نہ پاسکے گا۔“

”توصیف کیا تم صرف اپنے مرحوم شوہر ہی کے خیال میں رہ کر اپنی زندگی گزار سکو گی؟“ واصف اسے حسرت ناک نگاہوں سے تنک رہا تھا۔

”ہاں! میرے محبت کے جذبات سوچکے ہیں۔ اس لیے زندگی گزارنا کوئی مشکل نہیں۔“ صفیہ کی آواز بھراری تھی۔
 ”صفو! مجبور عورت یوں ہی تھپک تھپک کر اپنے جذبات سلا یا کرتی ہے لیکن وہ سو نہیں جاتے ان پر صرف ایک ہلکی سی غنودگی طاری ہو جاتی ہے جو زندگی کے ہلکے سے مد و جزر سے چونک کر انگڑائیاں لینے لگتے ہیں۔ کیا تم چند منٹ سے پہلے میرے بازوؤں میں آ کر اپنے جذبات کی بیداری نہیں دیکھ چکی ہو۔“ واصف اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”ہاں دیکھی ہے لیکن اب نہیں دیکھنا چاہتی۔ آپ مہربانی سے میری کٹھی سے اٹھ جائیے بڑی بہر بانی ہو گی۔“ صفیہ نے نظریں جھکا کر کہا۔ تاکہ اس کے ارادے واصف کی گہری نگاہوں سے ٹکرا کر شکست نہ کھا جائیں۔

”صفیہ! کیا یہ تمہارا قطعی فیصلہ ہے؟ کچھ تو سوچو! کیا تم نہیں دیکھتیں کہ خوشیاں ہم دونوں کو اپنی آغوش میں لینے کے لیے کتنی بے چین ہیں۔“

”میں اندھی ہوں۔“ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی کٹھی میں داخل ہو گئی اور واصف اسے جاتا دیکھتا رہا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ صفیہ کا ہر اٹھتا ہوا قدم اس کی زندگی کو پھل رہا ہے۔

صفیہ رات کو جاگ کر بے چینی سے ٹہلتی رہی ایک طرف اس کے شوہر کا زرد چہرہ تھا۔ دوسری طرف واصف کی گہری نگاہیں تھیں۔ زرد چہرہ اسے اپنی معیت میں گزرے ہوئے رات دن یاد دل رہا تھا اور آنکھیں اسے اپنی طرف کھینچ کر ماضی کی یاد کو بھلا رہی تھیں۔ وہ بے چین ہو کر اپنے شوہر کی بڑی بڑی تصویریں دیکھنے لگی۔ لیکن جلد ہی اسے ایسا محسوس ہوتا کہ مسکراتی ہوئی تصویر کی ساکن آنکھیں دو بڑی بڑی گہری آنکھوں میں تبدیل ہوتی ہیں۔ وہ گھبرا کر تصویر کو ہٹا دیتی اور منہ چھپا کر صوفے پر گر پڑتی۔ رات انہی بے چینیوں میں کٹ گئی اور صبح وہ دیکھ کر مطمئن ہو گئی کہ واصف کے ملازم اس کا سامان باندھ باندھ کر ٹھیلوں پر لا در ہے ہیں۔

سامان روانہ ہونے کے بعد واصف بھی جانے کے لیے تانگے میں سوار ہو گیا۔ صفیہ اسے جاتا ہوا دیکھنے کے لیے کھڑکی میں کھڑی ہو گئی۔ واصف کی نظریں صفیہ کے مرجھائے ہوئے چہرے پر پھیلتی ہوئی جھک گئیں۔ صفیہ کو ایسا معلوم ہوا کہ وہ ایک بار پھر بنتے بنتے بگڑ گئی اور اپنی اندھیری دنیا میں جلتے ہوئے چراغ کو خود ہی پھونک کر اندھیرے میں بھٹک گئی۔

”تانگہ تیز چلاؤ۔“ واصف نے کہا۔ صفیہ کو دیکھ کر اسے اپنی زندگی تباہ ہوتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ تانگہ تیزی سے چلنے لگا۔

واصف کی گردن اس کے سینے پر جھک گئی۔

”نہ جاؤ واصف!“ نہ معلوم کیوں صفیہ چیخ پڑی لیکن تا نگہ بہت دور نکل چکا تھا۔ وہ صوفے پر گر کر سسکیاں لینے لگی۔

”اب تو خوش ہوا!“ اس نے سامنے لگی ہوئی شوہر کی بڑی سی تصویر سے پوچھا۔ لیکن وہ مسکراتی ہوئی تصویر بالکل خاموش تھی۔

جیسے اسے صفیہ کے رنج و غم سے کوئی واسطہ نہ تھا۔



itsurdu.blogspot.com

معصوم

یہ ہی چودہ برس کی بھولی بھالی بس بالکل معصوم سی، ننھے منے لب ہر وقت ہلا کرتے۔ یوں ہی کچھ گایا کرتی۔ ماں کا سایہ بچپن میں سر سے اٹھ گیا تھا۔ باپ بھی آخر کب تک رنڈا بیٹھا رہتا۔ دوسری کر لایا۔ تھی جوان اور خوبصورت۔ بیوی کے کہے پر آنکھیں بند کر کے چلتا اور عروج کی زندگی برباد ہو رہی تھی۔ سوتیلی ماں بھلا اسے لکھنے پڑھنے کیوں دیتی۔ اس نے اپنے شوق سے کوشش کر کے دو چار کتابیں اردو کی گھر ہی میں پڑھ لی تھیں اور یہ بھی نہ جانتی تھی کہ دنیا کیا ہے۔ اس کی ایک سہیلی تھی فردوس، اس کی ہم عمر بالکل بھولی بھالی۔ کبھی کبھی باپ کی منت کر کے اس کے گھر چلی جاتی۔ ماں سینما دیکھنے کی شوقین تھی روز جاتی تھی لیکن عروج کو کبھی اپنے ساتھ نہ لے گئی اس کا خیال تھا کہ لڑکیاں خراب ہو جاتی ہیں۔ وہ اکیلی گھر میں بڑی رویا کرتی اور اسے اس وقت شدت سے احساس ہوتا کہ اسے کوئی بھی نہیں چاہتا جو اس کے گھبرائے ہوئے دل کو بہلائے۔ باپ اسے چاہتا تو تھا لیکن اظہار نہ کر سکتا تھا۔ بیچارہ کرتا بھی کیا پیری کے جوان سہارے کے ہاتھوں مجبور تھا، اگر وہ بیوی کے خلاف مرضی کچھ بھی کہتا تو وہ مانگہ بساتی اور وہ رنڈوے سے بھی بدتر ہو جاتا۔ لڑکی کا کیا۔ وہ تھوڑا ہی اس کے بڑھاپے کا ساتھ دیتی۔ وہ تو کسی دوسرے کی خواہشات کا نشانہ بننے کی چیز تھی۔ پھر بھی بھلا کیا خطا۔ اور وہ جاوید اس کی سوتیلی ماں کا منہ چڑھا بھانجہ۔ وہ بھی عروج سے سیدھی منہ بات نہ کرتا۔ جہاں اس کے پاس گئی جھڑک دیا۔ اس کے باوجود اس کے پاس گھس گھس کر بیٹھا کرتی اور اپنے پیارے پیارے گانے سنانے کی کوشش کرتی۔ اسے اپنے ماں کی منہ سے سنے ہوئے بہت سے فلمی گانے یاد تھے جن کو ہر وقت چپکے چپکے گنگنا یا کرتی۔

پڑھتے پڑھتے تھک کر جاوید نے کتاب میز پر ٹپک دی اور ایک طویل انگڑائی لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ اوہ! ہوں ہاں! اس نے آنکھیں کھول دیں۔ عروج اس کے پاس کھڑی گنگنا رہی تھی۔

”اچھا یہاں مت گاؤ، میں پڑھ رہا ہوں۔“ اس نے بیزار سی کہا۔

”تم تو بس ہر وقت پڑھا کرتے ہو۔ ایک گانا بھی سنو میرا۔ کتنا اچھا ہے۔ وہ اس کے پاس زمین پر بچھے ہوئے فرش پر بیٹھ گئی۔“

خدا کے لیے بھاگ جاؤ، میں گانا دانا نہیں سنوں گا۔“
”سنو گے کیسے نہیں۔“

”یہ تمہارا گانا مجھے فیل کر کے رہے گا آخر میں پوچھتا ہوں کہ یہ گانے کی بیماری تمہیں کب سے ہو گئی؟“
”جب سے تم نے امتحان کی تیاری شروع کی۔“ وہ لب سکڑ کر مسکرانے لگی اور جاوید کو اس کے بھولے پن پر ہنسی آ گئی۔
”تو تم چاہتی ہو کہ میں فیل ہو جاؤں؟“
”ہاں!“
”کیوں؟“

”تم مجھے جھڑکیاں کیوں دیتے ہو۔“
”تم ہو ہی اسی لائق۔“ اسے غصہ آ گیا اور وہ مزے سے گنگنانے لگی۔
”بالم آئے بسو مورے من میں۔“
”میں پوچھتا ہوں کہ آخر تم مجھے پریشان کرنے پر کیوں تلی ہوئی ہو۔“
”یہ پریشان کرنا ہے۔ سچ تم بڑے وحشی ہو، میں تو تمہارا دل بہلاتی ہوں۔“ وہ جاوید کا ہاتھ سہلانے لگی۔
”میرا دل تو بہت گھبراتا ہے اور کبھی کبھی زور سے دھڑکنے بھی لگتا ہے جاوید۔“ وہ اس کے پیروں کی طرف کھسک گئی۔
”تمہارا دل دھڑکتا ہے تو اپنے ابا سے کہو، کسی ڈاکٹر کو دکھا دیں میں کوئی دل کا معالج تھوڑا ہی ہوں۔“

”یہ تو میں بھی جانتی ہوں کہ تم دل کے معالج نہیں ہو، موت کے فرشتے ہو، اس نے جھڑکیاں کھاتے چڑ کر کہا اور جاوید کو سخت طیش آ گیا کہ ایک لڑکی نے اس کی توہین کر دی۔ اگر وہ چاہتا تو خالہ خالو سے شکایت کر کے بدلہ لے لیتا لیکن وہ اس منحوس گھڑی کو کونسنے لگا جب اس کی خالہ نے اسے اپنے پاس پڑھنے کے لیے بلایا۔ وہ اٹھ کر غصے سے ٹہلنے لگا۔
”آخر ٹہلنے کیوں لگے، کہو تو میں چلی جاؤں۔ دل گھبرا رہا تھا تو آ گئی تمہارے پاس!“
”تمہارا دل کسی اور سے نہیں بہلتا۔“

”کس سے بہلاؤں! اماں تو منہ سے بات نہیں کرتیں اور ابا کو تو مجھ سے نفرت ہو گئی ہے۔“
”ہاں تو میں ہی رہ گیا ہوں جس کا دماغ تم خراب کرو۔“

”مجھے تم اچھے لگتے ہو۔“ اس نے اپنی شفاف آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال دیں۔

”ہاں اچھا لگتا ہوں۔“ وہ کتابیں اٹھا کر کمرے سے نکل گیا۔

پانی برسنے سے سردی کچھ زیادہ ہو گئی تھی اور جاوید جو کالج سے آتے وقت پانی میں بھیگا تو حرارت ہو گئی لیکن تھا وہ بھی عجیب سا لڑکا لحاف تان کر پڑ رہا کسی سے کچھ کہا نہ سنا۔ سر کا درد بڑھ رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ کہیں طبعیت زیادہ خراب ہو گئی تو کیا ہوگا۔ امتحان کے صرف دو ماہ باقی رہ گئے تھے۔ کہیں فیل ہو گیا تو عروج کو خوش ہونے کا موقع مل جائے گا۔ اس خیال سے اس کا دل بھرا آیا۔

”ارے جاوید! تم یوں کیوں پڑے ہو۔“ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

جاوید نے کوئی جواب نہ دیا۔

”بولتے کیوں نہیں کیا دل گھبرا رہا ہے تمہارا بھی۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے جاوید کو جھنجھوڑ ڈالا۔

”چلی جاؤ یہاں سے عروج۔“ وہ گرج کر کہنے لگا۔ آخر میرے پیچھے کیوں بچے جھاڑ کر پڑ گئی ہو۔ تم کہو تو میں بغیر امتحان دیئے

ہی اپنے گھر چلا جاؤں۔ ہر وقت کی کوفت سے تو نجات ملے۔“

عروج اس کے متمنا تے ہوئے چہرے کو سہمی نظروں سے دیکھنے لگی یوں تو وہ جاوید کی بہت سی باتیں برداشت کیا کرتی تھی۔ لیکن

آج اس کا دل بھرا آیا اور سسک سسک کر رونے لگی۔ جاوید نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا اور وہ تھی کہ سکے جارہی تھی۔

”ہاں بہت برا لگا میرا کہنا جو اس طرح رو رہی ہو۔ دیکھتی نہیں کہ مجھے بخار چڑھا ہے۔ بس مجھے ستانے سے کام۔“ جاوید کو اس کی

لال لال آنکھیں دیکھ کر آج اپنی سخت کلامی پراسوس ہونے لگا۔

”اچھا اب مت رو۔“ جاوید نے اس کا گلہابی ہاتھ تھام لیا تا کہ وہ چپ ہو جائے۔

عروج کی سسکیاں بند ہو گئیں اور اس نے اپنا سر اس کے سینے پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ جاوید اس کی اس حرکت سے گھبرا

گیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اگر کوئی دیکھ لے تو کہے گا۔ بھلا اتنی بھی کیا نا سمجھی کہ میرے سینے سے لگی ہوئی ہے جیسے میں بھی

کوئی فرشتہ ہوں کیسے سمجھاؤں اسے عجیب لڑکی ہے۔

”جاوید! بڑے برے ہو تم۔“ اس نے ایسے کہا جیسے کوئی نیند میں بڑبڑا رہا ہو۔

”اب جاؤ عروج مجھے نیند آ رہی ہے۔“ وہ اسے الگ کرنے لگا۔

اس کے سینے میں نہ معلوم کیا ہو رہا تھا۔

”میں نہیں جاؤں گی دل گھبرا رہا ہے۔“ وہ اس کے بازوؤں میں منہ چھپانے لگی۔

”کتنی پاگل ہو تم عروج! جاؤ یہاں سے ورنہ کوئی کیا کہے گا۔“

”کوئی کیا کہے گا۔“ وہ ایک دم الگ کھڑی ہو گئی۔ بھولا بھلا چہرہ سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔ وہ اسے کیا سمجھاتا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ عروج کو چھوڑ کر کمرے سے بھاگ جائے لیکن عروج کی ماں نے آواز دی اور وہ دوڑتی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔

”جاوید! ارے جاوید! سنتے ہو! میں جا رہی ہوں فردوس سے ملنے، تم بھی چلو گے ساتھ۔“ وہ نیلے لباس میں چھم سے اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ جاوید نے محسوس کیا کہ وہ سینہ چیر کر دل میں گھسی جا رہی ہے۔

”میرا وہاں لڑکیوں میں کیا کام!“ وہ کھل کھلا کر ہنس دیا۔

”مت جاؤ“ میں نے کہا تم بھی چلتے تو اچھی اچھی چیزیں کھانے کو ملتیں اکیلے تو میرے حلق میں اٹکے گا۔ فردوس سے کہہ کر باہر تمہارے لیے کرسی ڈلوادیتی۔“

”تمہارے حلق میں کیوں اٹکے گا۔“ اس نے اس کے گلابی ہاتھ تھام لیے۔

”تم مجھے اچھے لگتے ہو۔“

”کیوں اچھا لگتا ہوں؟“

”اس لیے کہ جب میرا دل گھبراتا ہے تو تمہارے پاس چلی آتی ہوں پھر نہیں گھبراتا۔“ اس نے اپنا دکھتا ہوا رخسار اس کی پیشانی پر رکھ کر گلے میں ہاتھ ڈال دیے۔

”ایسا نہیں کرتے عروج!“ وہ اس کے حسین لمس سے کانپ گیا۔

”تم کو تو میری ہر بات بری لگتی ہے۔“ وہ منہ بسورنے لگی۔

”اور تو کیا اب تم رونے کا سامان کر رہی ہو۔“ اس نے اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

”پھر تم ایسی باتیں کیوں کرتے ہو؟ وہ ہنس دی۔

”اچھا اب جاؤ تمہاری سہیلی انتظار کرتی ہوگی۔“

”اچھا لیکن مٹھائی تمہارے لیے بھی لاؤں گی۔“

”ضرور!“ وہ اس کی معصومیت پر دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔ وہ کمرے سے نکل گئی۔

”کہو جاوید! پرچہ کیسا ہوا؟“

”بہت اچھا! شاید تمہاری تمنا پوری نہ ہو۔“

”کون سی تمنا؟“

”یہ ہی کہ میں فیل ہو جاؤں۔“

”سچ بڑے برے ہوتم! کیا میں یہ چاہوں گی کہ تم فیل ہو جاؤ۔ اس نے اپنے گورے گورے ہاتھ اس کی گردن میں ڈال دیئے۔“

”تو پھر میرے لیے دعا کرنا۔“ اس نے عروج کیدونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر زور سے دبا لیے۔ اس کا دل زور سے دھڑک رہا

تھا۔

”اچھا! جب سب پرچے کر لو گے تو میرا گانا سنو گے؟“

”خوب! کیا میں یہیں پڑا رہوں گا۔“

”تو پھر کہاں جاؤ گے؟“

”گھر!“

”اوہ! میں بھول ہی گئی تھی۔“ وہ اپنا سر تھام کر سوچنے لگی۔

”اور یہ تو بتاؤ کہ جب میرا دل گھبرا یا کرے گا تو کیا کروں گی۔“

”کچھ بھی نہیں! بس مجھے یاد کر لیا کرنا۔ کیوں مجھے یاد کرو گی عروج؟“

”ہاں! بہت یاد کروں گی! کیا تم ہمیشہ یہاں نہیں رہ سکتے؟“

”یہاں کیسے رہ سکتا ہوں۔“

”تو پھر مجھے بھی ساتھ لیے چلنا۔“

”اور دنیا کیا کہے گی؟“

”دنیا! بھلا بیچاری دنیا کو کیا پڑی ہے کہ کچھ کہے۔ تم تو بالکل عجیب سی باتیں کرتے ہو۔“

”اب میں تم کو کیسے سمجھاؤں۔ وہ اس کے گھٹنگھریا لے بال پیشانی پر بکھیرنے لگا۔“

”ارے سنو تو جاوید! ہم تم شادی کیوں نہ کر لیں، جیسے اماں سے ابانے کر لی۔“

ہشت! شادی بھی کوئی چیز ہے۔ میاں بیوی بس نباہ کرتے ہیں محبت تو ذرا بھی نہیں ہوتی۔“

”ہاں! تب تو بڑی بری چیز ہے۔ میں کبھی شادی نہ کروں گی۔“ وہ نفرت سے منہ بنا کر کہنے لگی اور جاوید منہ پھیر کر اس کے بھولے

پن پر مسکرا دیا۔

”ہاں کبھی نہ کرنا۔“

”لیکن بھی تم جانا مت۔“

”اچھا! نہ جاؤں گا۔“ اس نے ٹالنے کے لیے کہہ دیا۔ ویسے تو اس وقت یہ سوچ کر اسے بھی رنج ہو رہا تھا کہ پھر یہ بھولی بھالی

باتیں کہاں سننے کو ملیں گی اور اس کے حسین لہجے کا کبھی پھر کہاں نصیب ہوگا۔ عروج اس کے جواب سے مطمئن ہو کر گنگنا نے لگی۔

”بھول نہ جانا، پریت نبھانا۔“

آخری پرچہ بھی بہت اچھا ہو گیا۔ جاوید خوشی سے جھومتا گھر آیا اور کھانا کھا کر گھومنے نکل گیا۔ عرصے سے وہ کہیں تفریح کے لیے

نہ گیا تھا۔ بس ہر وقت کتابوں کا کیڑا بن رہتا۔ غریب والدین کا لڑکا اگر فیل ہو جاتا تو پھر کاہے کو تعلیم مکمل کرنے کی نوبت آتی۔ لیکن

اب تو پرچے اتنے اچھے ہو گئے تھے کہ کامیابی کا یقین کامل تھا اسے۔ اسی خوشی میں گئے ہاتھوں سینما کے پہلے شو میں جا بیٹھا۔ اور جب

واپس آیا تو خالہ خالو گھر سے غائب تھے۔ نوکر ڈیوڑھی میں پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ آج وہ لوگ بھی دوسرے شو میں چلے

گئے ہیں۔ وہ سیدھا اپنے کمرے میں پہنچا۔ عروج اس کے کمرے میں فرش پر پڑی بے خبر سو رہی تھی۔ لیمپ کی مدھم روشنی میں اس کا

گورا سا چہرہ بڑا پیارا لگ رہا تھا۔ وہ اسے محبت سے دیکھنے لگا۔ شاید اسی کا انتظار کرتے کرتے سو گئی ہے۔ وہ اس کے نزدیک بیٹھ گیا اور

سوچنے لگا کتنی معصوم ہے اسے بھلا کیا معلوم کہ کل میں چلا جاؤں گا۔ مجھے یاد کر کے رویا کرے گی۔ اور یہ کتنی نادان ہے۔ اکیلا گھر

رات کا سناٹا اور میرے کمرے میں تنہا پڑی سو رہی ہے۔ جیسے کہ میں انسان ہی نہیں ہوں۔ عروج نے کروٹ لی اور جاوید کے پاس

سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ بالکل چوروں کی طرح جو کسی موقع کے منتظر ہوں۔ اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا اور جسم میں ایک عجیب سی

کپکپاہٹ ہونے لگی۔ ایسی کپکپاہٹ جس سے شاید وہ خود بھی واقف نہ تھا۔ عروج پہلی لڑکی تھی جو اس کی تنہائیوں میں بلبل بن کر چہک

اٹھی۔ ورنہ اسے اتنی فرصت کہاں کہ کسی لڑکی کا خیال بھی دل میں لاتا۔ وہ سانس روکے کھڑا اس کی معصوم سرخ دہکتی ہوئی صورت دیکھ رہا

تھا۔ معا اس کے دماغ میں یہ خیال کروٹیں لینے لگا کہ اگر یہ معصوم ہے تو میں کیوں اتنا بھولا بنا ہوا ہوں۔ اس نے گھڑی دیکھی گیارہ بج رہے تھے۔ ابھی خالہ خالو کے آنے میں بہت وقت تھا۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اندر دروازہ بند کر لیا اور عروج کے پاس بیٹھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے کروٹ لے کر آنکھیں کھول دیں۔

”ارے تم آگئے جاوید! مجھے اکیلے ڈر لگ رہا تھا۔ ابا! اماں کتنے ظالم ہیں مجھے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ اچھا تم بھی سو جاؤ اب میں جاتی ہوں تم آگئے اب میں نہ ڈروں گی۔“ وہ کچھ سوئی کچھ جاگی سی دروازے کی طرف بڑھی لیکن پیچھے سے دوخت ہاتھوں نے اسی اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔

”مجھے نیند آ رہی ہے جاوید اب تم بھی سو جاؤ۔“ اس نے کہا، لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ بازوؤں کی گرفت اتنی مضبوط ہوئی کہ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ کتنی معصوم تھی وہ لیکن وہ تو مرثیہ تھا۔

صبح عروج کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور پہونے پہونے ہوئی ملتے ہوئے لب ساکت چہرے کی سرخی غائب تھی اور دبی دبی سسکیوں سے معلوم ہوا کہ رات بھر روئی ہے۔ جاوید اپنے کمرے میں سامان سفر باندھ رہا تھا۔ ٹرین کا وقت قریب تھا اور وہ جلدی جلدی تیار ہو گیا اور سامان تانگے پر رکھوا کر وہ خالہ خالو سے ملا۔ خالہ نے آنسو بہا کر اسے رخصت کیا اور وہ خالو کی دعائیں لیتا ہوا تانگے پر سوار ہو گیا۔ لیکن جس کمرے میں عروج پڑی سسکیاں بھر رہی تھی اور نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اس کی کنول جیسی آنکھیں انگارہ ہو رہی تھیں اور دل میں سب کی طرف سے نفرت کے جذبات امنڈ رہے تھے۔



باندی کی عید

”ارے موئی! تجھ پر خدا کی سنوار آج عید کے دن بھی مرمر کے کام کر رہی ہے۔ جوان جہاں ڈیل اور مرمل گھوڑی کی طرح چلتی ہے۔ جلدی سے چولہے میں آگ ڈال کر پانی گرم کر۔ ورنہ بچوں کو عید گاہ جانے میں دیر ہو جائے گی۔“ بیگم صاحبہ نے لحاف سے سر نکال کر اپنا گلا پھاڑا اور گلشن بارچی خانے کی آدھی جھاڑ چھوڑ کر آگ جلانے لگی۔ چھوٹے بڑے ایک درجن چہرے لحافوں سے نکلے ہوئے آپس میں اپنے اپنے کپڑوں کی بٹیکل کر رہے تھے۔

”چلو تم سب باورچی خانے میں۔“ بیگم صاحبہ نے لحاف پھینک کر اپنی فوج کی سپہ سالاری کرتے ہوئے باورچی خانے پر چڑھائی کر دی اور بارہ جوڑے ہاتھ چولہے کے باہر نکلتے ہوئے شعلوں پر چھا گئے۔

”تو نے اب تک بچوں کے لیے چائے بھی تیار نہیں کی! خدا تجھے موت دے۔ اگر بچوں کے سردی لگ گئی تو تیرے باپ کا کیا جائے گا۔“

”بیوی! آپ ہی نے تو کہا تھا کہ پانی گرم کر۔“ عید کے دن کو سنے سنکر گلشن کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

”تو اب جا کر پانی ٹپ میں سمودے پھر چائے کا پانی چڑھا دے۔“ گلشن نے جلدی سے پانی سمو کر چائے کا پانی چولہے پر چڑھا دیا اور فوج کا رخ غسل خانے کی طرف مڑ گیا۔

”اری اندھی کیا بچے یوں ہی پانی، ٹپکتے ہوئے جسم پر کپڑے پہن لیں گے تو لیہ بھی نہیں رکھا۔“

چائے کا پانی کھول رہا تھا وہ چھوڑ کر تولیہ لینے بھاگی۔

”اری چل مردار!“ تولیہ دیتے دیتے وہ زور سے چیخیں۔ ”چائے پیالیوں میں نکال کر رکھ جا جلدی کھڑی کیا دیکھ رہی ہے۔“

گلشن چائے تیار کر کے پیالیوں میں انڈیلنے لگی۔ بیگم صاحبہ نے بچوں کو نہلا دھلا کر اپنی بڑی صاحبزادی کے سپرد کرتے ہوئے کہا۔

”ناہید! جان ذرا تم اپنے بھائی بہنوں کے کاہل اور عطر لگا کر کنگھی کر دو۔“

”گلشن! اب میرے لیے پانی گرم کر اور دیکھ ان سب کے لیے یہیں چائے لے آ۔“ ناہید نے بچوں کے کنگھی کرتے ہوئے چیخ

کر کہا اور گلشن پیالیاں سینی میں رکھ کر کمرے میں لے گئی۔ بچے چھٹ کر پیالیاں اٹھانے لگے۔ کسی کا ہاتھ جلا اور کسی کے کپڑوں پر چائے گرمی تو کسی کے چائے پیتے میں ہونٹ جلے۔

”کھڑی کیا دیکھ رہی ہے مردار! جا کر اب میرے لیے بھی پانی سمودے۔“ ناہید نے گلشن کو کھڑے دیکھ کر کہا۔
”ابھی تو آپ کا پانی گرم بھی نہیں ہوا۔“

”پانی کیسے گرم ہو! ادھر کھڑی ہے ادھر کھڑی ہے۔ حرامزادی جا جلدی۔“ ناہید غصے سے لال پیلی ہو گئی اور گلشن نے پتیلے میں پانی بھر کر چولہے پر چڑھا دیا۔ سردی سے اس کے جسم میں رعشہ سا ہو رہا تھا۔ وہ ذرا جسم کو گرم کرنے کے لیے چائے نکال کر پینے لگی۔ ابھی دو گھنٹہ ہی حلق سے اترے تھے کہ باہر سے آ کر کلوا حلق پھاڑ کر چیخا۔

”اری گلشن تا نگہ آ گیا ہے۔ عید گاہ جانے کے لیے بچوں کو سوار کر دے۔“
بیگم صاحبہ نے بچوں کو تہواری دے کر بلائیں لیتے ہوئے رخصت کیا اور گلشن نے گود میں لاد لاد کر سب چھٹی پوٹوں کو تانگے میں سوار کرایا۔

”اری گلشن! تو نے ابھی تک کپڑے نہیں پہنے۔“ کلو نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔
”فرصت ہی نہیں ملتی۔“

”جیسے ہماری قسم! ضرور پہننا ضروری تیرے گورے مکھڑے پردہ میرا لایا ہوا سرخ و پندہ ہزار بناؤ دے گا۔“
”چل! تو تو ایسی ہی باتیں کرتا ہے۔“ گلشن شرما کر اندر بھاگ گئی اس کا دل چاہ رہا تھا کہ جلدی سے کپڑے پہن کر کلوا کو دکھا دے۔ وہ جلدی جلدی پچی ہوئی چائے پینے لگی۔

”اری! میرا پانی سمو یا نہیں؟“ ناہید نے گھور کر اسے دیکھا اور وہ پتیلے لے کر غسل خانے کی طرف بھاگی۔ پتیلے سے گرم گرم پانی چھلک کر اس کے پاؤں پر گر اور وہ سسک سسک کر رونے لگی۔“

”اری بس بالکل بے ہوش ہو کر چلتی ہے۔ جاذرا سانا ریل کا تیل پاؤں پر لگا لے۔“ بیگم صاحبہ نے ہمدردی سے اسے دیکھا۔
”پہلے تو جلدی سے پانی سمودے! پھر لگانا تیل پھیل۔“ ناہید نے جلدی کر کہا۔ اگر اس کی سہیلیاں اس سے عید ملنے آ جائیں تو اس حالت میں دیکھ کر کیا کہیں گی۔ اس خیال ہی سے ناہید کے غصے کا پارہ بڑھتا جا رہا تھا۔

گلشن نے پانی سمو کر اسی پتیلے میں اپنے نہانے کے لیے بھی پانی رکھ دیا اور پاؤں میں تیل لگانے لگی۔ ناہید چھٹ پٹ نہا کر نکلی

اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی زرد رنگار پوشاک پہننے لگی۔

”اری! تجھ پر علی کی سنوار خدا کی مار ابھی تک اپنے جلے پاؤں کو ہی لئے بیٹھی ہے۔ ناہید کے لیے بھی چائے لا۔ بیگم صاحبہ ناہید کے تھر تھرانے ہوئے جسم کو دیکھ کر بے تحاشہ چیخی۔ گلشن چائے لے کر ناہید کی طرف دوڑی اور چائے دے کر اس کی چمکتی ہوئی پوشاک کو حسرت بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

”کھڑے ہونے کا وقت نہیں ہے جا کر سویوں کا زردہ پکا لے اب سب کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔“ بیگم صاحبہ نے اپنی بیٹی کی بلائیں لے لے ہوئے کہا اور گلشن پتیلہ اتار کر سویاں پکانے لگی اور باورچی خانے میں اس کے ٹنگے ہوئے کپڑے اسے بار بار اپنی طرف توجہ دلا رہے تھے۔ اس نے جلدی سے سویاں تیار کر کے پھر پانی کا پتھلہ چولہے پر چڑھا دیا اور اپنے کپڑے غسل خانے میں ناگ آئی۔ پانی ہلکا سا ہو گیا تھا۔ اس نے اسی کو غنیمت جانا اور پانی ٹب میں ڈال کر بال کھولنے لگی۔ اتنے میں بچے شور کرتے ہوئے عید گاہ سے واپس آ گئے۔

”اری! کہاں مرگئی گلشن کی بچی! بچوں کو سویاں کھلا پلا دے۔ اب بھوکے ہوں گے۔“ بیگم نے کہا۔ وہ بال پیچھے کر کے پھر باورچی خانے کی طرف دوڑی اور سب بچوں کو سویاں نکال کر دینے لگی۔

”گلشن! باہر میاں کے دوست آئے ہیں ذرا جلدی سے سویاں نکال دے۔“ کلو نے باہر دہلیز میں کھڑے ہو کر کہا اور وہ بچوں کو سویاں دے کر باہر کے لیے نکالنے لگی۔

”اری گلشن بی! ہمسائی آئی ہیں ان کے لیے سویاں نکال لا۔“ بیگم صاحبہ نے بی ہمسائی سے عید ملتے ہوئے حکم لگایا اور گلشن باہر کے لیے سویاں کلو کو دے کر ہمسائی کے لیے سویاں نکالنے لگی کہ ناہید نے اپنی سہیلیوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا۔

”میری سہیلیوں کے لیے بھی سویاں لے آ گلشن۔“ وہ ہمسائی کو سویاں پہنچا کر ناہید کی سہیلیوں کے لیے سویاں نکالنے لگی۔

”اور ذری گلشن! کھڑکی میں بی شکیلہ سے کہہ دو کہ کیا آج ہم سے پردہ کر کے بیٹھی ہو۔“ گلشن سویاں میز پر رکھ کر کھڑکی میں ناہید کا پیغام شکیلہ کو پہنچانے لگی۔

”ارے گلشن! باہر کے لیے پان بنوا دے۔ کلو نے پکارا اور وہ بیگم صاحبہ سے پان بنوا کر کلو کے پاس لے گئی۔

”ہائے اب تک یونہی پھر رہی ہے اب پہن لے نا کپڑے۔“ کلو نے پان لے کر کہا۔

”اب جارہی ہوں نہانے۔“

”ہمیں بھی کپڑے پہن کر دکھائیوں گلشن!“ کلونے سے لپٹائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

”چل تو میرا کون ہے؟“

”بیگم صاحبہ تو کہتی تھیں تیری شادی مجھ سے ہوگی۔“ کلونے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”ہائے اللہ!“ وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر بے تحاشا بھاگی اور غسل خانے میں گھس گئی کہ لاؤ دو لولٹے پانی ڈال کر کپڑے پہن لے۔ سامنے ٹنگے ہوئے کپڑے اس کے دل میں گدگدی کرتے تھے۔ سرخ چھینٹ کا چوڑی دار پانچجامہ چکن کا کرتہ اور کلو کا لایا ہوا مخمل کا سرخ دوپٹہ۔ وہ سوچنے لگی کہ آج موا کلو کیسا اچھا لگ رہا ہے۔ کیلے کی لال اچکن اور کڑھی ہوئی دوپٹی ٹوپی گلوڑا بالکل لکھنوکا بانکا نواب معلوم ہوتا ہے اور منہ میں بیڑی دبائے انجن کی طرح بھک بھک دھواں نکالتا ہے تو بالکل بڑی بٹیا کے مگلیتر کی طرح خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔ لیکن آج جب میں کپڑے پہنوں گی تو بالکل رانی لگوں گی۔ اس نے کپڑے اتار کر پانی نکالنے کے لیے ٹب میں لوٹا ڈالا تو پانی برف کی طرح سرد ہو رہا تھا۔ اس کا خوشی سے چمکتا ہوا چہرہ ایک دم مغموم ہو گیا اور اس کی خوشیوں کا خون آنکھوں کی راہ بہہ نکلا۔

”او گلشن! کہاں مر گئی؟“ بیگم صاحبہ کے چیخنے کی آواز سن کر ہی میلے چیکٹ کپڑے پہن لیے اور آنسو پونچھ کر بھاگتی ہوئی ان کے پاس پہنچ گئی۔

”نصیبو جلی دیکھ چار بج گئے سب کچھ تو پکنے کو رکھا ہے۔ کیسی رونی صورت بنائے ہوئے ہے۔ نوج بیوی کسی کے پلے ایسے نوکر پڑیں گلوڑی کو کسی دن نکال باہر کروں گی۔ روٹیاں کھا کھا کر بہت موٹی ہوئی ہے شام کو جب مہمان آئیں گے تو تیری بوٹیاں ہی کھلا دوں گی۔“

وہ بیگم صاحبہ کے عتاب سے بچنے کے لیے جلدی سے شام کے کھانے کے انتظام میں منہمک ہو گئی۔ اور جب وہ کسی کام کے لیے غسل خانے کی طرف نکلتی تو اس کی نظریں کھوٹی پر ٹنگے ہوئے کپڑوں پر پڑ جاتیں تو وہ اس طرح نظریں جھکا لیتی جیسے وہ اس کے لیے نہیں ہیں۔



تین ملاقاتیں

”ہائے اللہ! پھوٹ کیوں نہیں جاتیں یہ آنکھیں ہر وقت سامنے سے قبرستان کا دیدار ہوتا رہتا ہے۔ آنکھیں تھک گئیں، طبیعت گھبرا گئی۔ اس روح فرسا نظارے سے بعض وقت تو اپنی زندگی خطرے میں نظر آتی کہیں اس قبرستان نے مجھے بھی گھسیٹ لیا تو کیا کر لوں گی کسی کا۔ لیکن اماں ہیں کہ برابر قبرستان سے مقابلہ کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ آخر اس مکان سے اٹھ کیوں نہیں جاتیں۔ مجھے تو یہ قبرستان پاگل بنا دے گا۔ جواب میں ہمیشہ یہی فرمایا گیا کہ بچاری ایسی ننھی ہے کہ قبریں دیکھ کر ڈرتی ہے۔ آخر میں نے ایک دن تنگ آ کر کہہ دیا کہ میں اب نہ رہوں گی۔ مجھے کہیں بھیج دیا جائے۔ یا یہ مکان چھوڑا جائے۔“

”چلی جاؤ جہاں تمہارا جی چائے۔“ جواب صاف تھا۔ میں نے بھی چچا کو تار کر دیا کہ اسٹیشن پر ملیں اور سامان سفر درست کر کے صفا گھر سے نکل بھاگی دوران سفر میں کوئی خاص تکلیف نہ ہوئی اور چچا بھی اسٹیشن پر مل گئے۔ ورنہ میں تو سہم رہی تھی کہ کہیں زیادہ افیون نہ کھالیں تار ملنے کے بعد ورنہ پھر نشے میں کس کو کچھ ہوش رہتا ہے۔ چچا دعاؤں کی بوچھاڑ کرتے ہوئے مجھے گھر لے گئے۔ مکان شہر سے کافی دور تھا اور گرد و پیش کا ماحول بھی کچھ سازگار معلوم نہ ہوتا تھا اور مکان کے آگے چھوٹا سا باغ دیکھ کر کمبخت قبرستان کو بالکل ہی بھول گئی اور دو چار نوالے کھا کر آرام سے پلنگ پر دراز ہو گئی۔ نیند ایسی آئی کہ ہوش ہی نہ رہا اور جب اپنے جسم پر کھر درے اکڑے ہوئے ہاتھ پڑنا شروع ہوئے تو ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ چچا پیار سے مار مار کر مجھے جگانے کی کوشش فرما رہے تھے۔ ان کے ساتھ ناشتہ کر کے اپنا پیچھا چھڑایا اور چچا کے مطالعے کے کمرے میں گھس گئی۔ آہا چمکتی ہوئی مجلد کتابیں، دل چاہا کہ سب ایک ساتھ پڑھ ڈالوں، لیکن کوئی ترکیب سمجھ میں نہ آئی اور آخر ایک ہی کتاب پر اکتفا کی۔ یا اللہ! کوئی تو ایسی ترکیب ہوتی کہ بیک وقت دو دو تین تین کتابیں پڑھی جاسکتیں۔

”کھانا کھا لو شہلا!“ چچی نے آ کر کہا۔ ابھی تو اچھی طرح پڑھ بھی وہ نہ پائی تھی۔ بس کیا مصیبت ہے۔ کھانا بھی کھانا ہی پڑا اور پھر اس کے بعد آرام بھی ضروری ہوا کرتا ہے ایک کتاب لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی گرمیوں کی دو پہریں بھی کیسی آفتیں ہوتی ہیں۔ گرمی کے مارے برا حال ہو رہا تھا اور پھر پسینے کی سڑا ہند نہ جانے کب بازوؤں میں منہ چھپا کر سو گئی۔ جب جاگی ہوں تو پانچ بج رہے

تھے۔ جلدی جلدی غسل کیا اور سیدھی باغ پہنچی مالی پودوں میں پانی دے چکا تھا۔ مٹی بھگنے سے سوندھی سوندھی خوشبو آ رہی تھی۔ اور پھولوں کی عطر جیسی خوشبو دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ اڑا اڑا دھم! باغ کے پھانک کے پاس سائیکل گرنے کی آواز نے مجھے ادھر متوجہ کر دیا۔ ایک گورا گھٹکھریا لے بالوں والا لڑکا کپڑوں سے خاک جھاڑ رہا تھا۔ جیسے ہی میری آنکھیں چار ہوئیں وہ سائیکل سوار بھاگا۔ مجھے ان بے تکے سائیکل سواروں پر ہنسی آ رہی تھی۔ پھر ذرا ہی دیر میں کھر کھر کی آواز آئی۔ دیکھا تو وہی حضرت شان سے پھانک کے پاس سے بار بار سائیکل پر گزر رہے ہیں اور مزے کی بات یہ تھی کہ اب کی وہ ہاتھ چھوڑ کر سائیکل چلا رہے ہیں یعنی کہ اس وقت تو اتفاق تھا جو بیچارے گر پڑے۔ ورنہ وہ تو یوں بھی اپنی سائیکل کا نہ مہارت کا کافی ثبوت دے چکے تھے۔ میں دل ہی دل میں خدا سے دعا کرنے لگی کہ کمبخت ایک بار تو اور گرے، پھر معلوم ہو مزا پھانک پر چکر لگانے لگا۔ جب وہ بھی پھانک کے پاس سے گزرتا مجھے دیکھ کر مسکرانے لگتا۔ میں نے منہ پھیر لیا۔ یعنی کہ راہ چلتے آوارہ لونڈے کسی شریف لڑکی کو اپنے باغ میں ٹھہلنے بھی نہ دیں۔ اور ایک بار جو میں نے آنکھیں سے ادھر دیکھا تو ہو حضرت سائیکل تھا اے شان سے پھانک کے پاس کھڑے مستعدی سے مجھے گھور رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بند پھانک توڑ کر لے بھاگے گا جیسے کہ میں اس کے باپ کی کسی وجہ سے ملنے والی چیز تھی۔ مجھے اس کی حرکت نا جائز پر سخت تاؤ آ رہا تھا لیکن کر ہی کیا سکتی تھی یہ مرد تو منہ لگا لگا ڈوبنے کے برابر ہوتے ہیں اگر کچھ کہا سنا تو بس سر پر چڑھ جائے گا میں نے پھر اس کی طرف دیکھا اور اب کی جو آنکھیں چار ہوئیں تو وہ بچوں کی طرح کھلکھلا کر ہنس دیا۔ ہوں! یہ بات ہے! اب تو میں نے سوچ لیا کہ وہ سبق دوں کہ پھر کسی لڑکی کو گھورنے کی ہمت نہ کرے۔ میں تیزی سے اس کی طرف بڑھی اور دانت کٹکٹا کر کہا۔

”کیوں جی! یہ کیا حرکت ہے۔ کیا تمہاری اماں بہنیں نہیں ہیں؟“

”اماں بہنیں تو سب درجنوں ہیں، لیکن بیوی نہیں ہے۔“ اس نے بڑے اطمینان سے کہا اور میں جل کر رہ گئی۔ میں نے سوال ہی غلط کیا تھا۔ اس سے تو گالیوں سے بات کرنا چاہیے تھی۔ کمبخت صورت سے کیسا شریف لگتا ہے اور ہے ایسا گھنا۔

”شرم بھی اڑ گئی تم چھو کروں کی۔“ میں نے ذرا بزرگی جتنا کہ شاید رعب گلہ جائے۔

”اور شرم نہیں آتی تم ناگ ناگ برابر چھو کروں کو جو یہاں ٹھہل رہی ہو۔ آنکھیں نہیں منہ پر سڑک سے سارا سامنا ہوتا ہے اور اگر کوئی کھڑا ہو جائے تو تر کھا لگتا ہے۔“

”بے غیرت! بد تمیز! آوارہ۔“ میں غصے سے کانپ رہی تھی یعنی کہ مجھ سے تم کر کے مخاطب کیا۔ جیسے بڑی بے تکلفی ہے۔ کمبخت کوئی لکھنؤ بھی نہیں بھیج دیتا کہ ذرا تکلف سیکھ آئے۔

”آپ کو کیا مطلب میں جو بھی ہوں۔“ وہ برابر مسکرائے جا رہا تھا۔

”گستاخ!“ میرے منہ سے برابر بری باتیں نکل رہی تھیں اگر مالی ہوتا تو پٹوا کر چھوڑتی۔

”کاش! تمہیں دیکھنے کی گستاخی روز کرتا رہوں۔“ وہ جھومنے لگا۔

”شاعر معلوم ہوتے ہو۔“ گالیوں سے تو وہ قابو میں آیا نہیں، میں نے مضحکہ اڑانا شروع کیا۔

”اور تم ناصح!“ اس نے چٹ کر کہا۔

”کیا بکو اس ہے دفعہ ہو یہاں سے۔“ میں نے جھنجھلا کر کہا لیکن اتنا ضرور سمجھ گئی کہ ہے یہ بڑا تیز دہنے کا نہیں ضبیٹ۔

”میں سڑک پر کھڑا ہوں تمہارا کیا جاتا ہے۔ میں تمہارے باغ میں تو ہوں نہیں جو حکم لگاؤ۔“ اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا اور

شرارت اف آنکھوں اور ہونٹوں پر تڑپنی جا رہی تھی۔

”یہ تو میں بھی جانتی ہوں کہ تمہارے جیسے آوارہ لوگوں کے گھروں سے نکالے ہوئے ہوتے ہیں۔ پھر سڑک پر کھڑے نہ ہو تو کیا

کرو۔“ میں بری طرح تپ رہی تھی۔

”یقین کرو کہ ابھی تک تو گھر سے نکالا نہیں گیا، پر اب ضرور تمنا ہے کہ گھر سے نکال دیا جاؤں تو اسی پھانک کے پاس پڑ رہوں۔“

”تمہاری کسرتی بند نہیں ہوتی۔“ میں غصے سے سرخ ہو رہی تھی۔

”خوب! خود ہی تو آئیں مجھ سے باتیں کرنے۔ اب جاتی کیوں نہیں۔ میرا دماغ چھانچ کر دیا۔“ اس نے مجھ پر انٹی دھونس گا نھئی

اور یہاں یہ حال کہ پیروں نے جسم سنبھالنے سے انکار کر دیا۔ کپکپاہٹ کے مارے برا حال لیکن اس کے ڈھیٹ پن سے گھبرا کر

بھاگ جانا بھی بزدلی تھی۔

”جاتے ہو یا مالی کو بلاؤں۔“

”مالی!“ اس نے قہقہہ لگایا۔ ”کیا پٹوانے کا ارادہ ہے؟“

”اور نہیں تو کیا چھوڑ دینے کا۔“

”خیر اگر پٹوانا ہی ہے تو بسم اللہ لیکن یہ تو بتاؤ مجھے پٹنا دیکھ سکوگی۔“ پٹنا دیکھنا کیسا! اگر میرا بس چلے تو تمہاری بوٹیاں نوچ

ڈالوں۔“ میں غصے سے دیوانی ہو رہی تھی۔

”بس چلنے کی ایک ہی رہی میں تیار ہوں لیکن تم کو باہر آنا پڑے گا یا پھر مجھے اپنے پاس آنے کی اجازت دو بولو تیار ہونا۔“

”بد معاش!“ ہائے اللہ میں کیسی بری پھنسی کہیں اس قبرستان کا یہ کوئی مردہ بھوت بن کر تو میرا پیچھا نہیں کر رہا ہے ارے چلی جاؤں گی پھر وہیں اب تو تو بھاگ جا اپنی قبر میں۔ میں نے اسے خوف سے دیکھا تو ٹھٹھاٹ سے مسکرا رہا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”محبت کو معراج پر پہنچانے کے لیے رونا ضروری ہے۔“ وہ زور سے ہنسا اور سائیکل پر سوار ہو گیا۔ اور میں بے تحاشہ بھاگی۔

”بیٹا! اتنا مت ٹھہلا کر دیکھ تو منہ سرخ ہو رہا ہے۔“ چچی نے مجھے اپنی گردن کا ہار بنالیا اور دیکھیں چٹا چٹ پو پلے منہ سے پیشانی چومتے سچ تو یہ ہے کہ ان کی ہمدردی نے مجھے رلا دیا پہلے سے بھری بیٹھی تھی۔

”کیا ہوا کیوں روتی ہے۔“

”کچھ نہیں۔“ بھلا میں ان کو کیا بتاتی۔

”خیر تو کچھ نہ کہے تو کیا ہوا۔ میں سب سمجھتی ہوں۔“ چچی نے مسکرا کر کہنا شروع کیا اور میں کانپ گئی کہ لو سب انہوں نے بھی دیکھ لیا۔

”ارے ہاں دل گھبراتا ہوگا لونڈ یا سیانی ہونے آئی منہ سے کیا کہے اماں کو خود فکر کرنا چاہیے۔ میں نے کتنی بار تو رقعے بھیجے کیا سیدھا ہے میرا لال پر وہ نہ معلوم کس ہوش میں ہیں۔ لڑکی کا اچار پڑا جاتا ہے۔

خوب سمجھیں مجھے چچی پر بھی تاؤ آ گیا۔ یہ نہ معلوم کیوں اپنے بھانجے کے ساتھ میری لٹیا ڈبونا چاہتی ہیں۔ میں تو ایک بار ان حضرت کو دیکھ بھی چکی ہوں بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وحشی قبیلے کے سردار نے بطور سزا کان پکڑ کر نکال دیا ہے اور وہ ادھر ادھر پناہ لیتے پھرتے ہیں۔ میں چچی کے گلے سے اپنا گلا چھڑا کر بستر پر دھر رہی۔

دوسرے دن میں نے تہیہ کر لیا کہ باغ میں نہ جاؤں گی۔ پھر وہ کتا مل گیا تو غضب ہی ہو جائے گا۔ لیکن چار بجے سے گرمی نے اس بری طرح ستایا کہ کھلی فضا میں جانے کے لیے دل تڑپ اٹھا۔ اگر وہ مل بھی گیا تو کیا میں اس کی طرف نظر ہی کیوں اٹھاؤں جو سر پر سوار ہو جائے چپکی شہلٹی رہوں گی۔ آخر ایک شریر لونڈے کے کارن میں اپنا دم کیوں گھونٹوں۔ نہادھو کر ٹیلے پہنچ گئی۔ لیکن دل سہا جاتا تھا کہ کہیں وہ سچ سچ نہ آ جائے۔ نگاہیں بار بار پھانک کی طرف اٹھ جاتیں اور ایک بار جو میری نظروں کا تصادم لوہے کی سلاخوں سے ہوا تو وہ ٹھٹھاٹ سے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ یا اللہ! تو ہی اپنے آوارہ بندوں سے ہم شریفوں کو بچائیو۔ میں کانپ کر رہ گئی۔

”ناصح سلام!“ اس نے نظریں چار ہوتے ہی سلام پھینک دیا اور میں نے نظریں جھکا لیں۔

”میں جانتا تھا کہ آج بھی ضرور آؤ گی۔“ وہ وہیں سے کھڑا چنچ رہا تھا اور یہاں یہ حال کہ دل دھڑک دھڑک کر سینہ توڑے دیتا ہے۔

”ارے سنو تو کوئی تمہارے در پر کھڑا ہے اور تم ہو کہ کوئی پرواہی نہیں۔“ وہ اور بھی زور سے چیخا۔ میں گھبرا گئی کہ کہیں یہ آوازیں چچی کے کان تک نہ پہنچ جائیں۔ اور پھر یہ راہ گیر کیا کہتے ہوں گے میں اپنی بیکیسی پر بلبلا اٹھی۔ یہ ضرور مجھے گرمی میں سزا دے گا۔

”نہیں سنو گی تم؟“ اس نے زور سے گلا پھاڑا اور میں اسے چپ کرانے کے لئے بے تحاشا اس کی طرف بھاگی۔ وہ مجھے آتا دیکھ کر مسکرایا۔

”لہ میرا پیچھا چھوڑ دو کیا بدنام کرنے کی ٹھانی ہے۔“ میں گھلپائی۔

”عجیب ہو تم بھی، کیا بچہ جس کھلونے کو پسند کرے گا وہ دوسرے کو دے گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس سے زبردستی چھین لیا جائے۔“ وہ پہلی بار سنجیدہ ہو رہا تھا۔

”لیکن بچہ نادان ہوتا ہے۔“

”لیکن نادانی کی غلطیاں حسین بھی ہوتی ہیں۔ اگر ہم بدنام ہو جائیں تو ضرور ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں گے۔“ وہ کسی عجیب سے سرور سے جھوم رہا تھا۔ یا خدا اب میں کیونکر اپنا پیچھا چھڑاؤں۔ سوت نہ کیا اس کو ری سے لٹھم لٹھا کر رہا ہے۔ میں اس کتے کے پلے کی بنوں گی۔

”آخر آپ کا مطلب کیا ہے؟“ میں اب مودب بن کر اسے شریف بن جانے پر مجبور کرنا چاہتی تھی۔

”یہ تو آپ میرے دل سے پوچھیں۔“ اس نے بھی انتہائی ادب سے کہا۔

”تو پھر آپ کا دل ہی کچھ فرمائے۔“ میں بری طرح تپ رہی تھی۔

”بگڑیے گا نہیں اب میرا دل بولنے والا ہے۔“

”ہوں!“ میں نے بیکیسی سے کہا۔

”میرا دل کہتا ہے کہ مجھے تم پہلی نظر میں بہت اچھی لگیں۔ آنکھوں کا چڑھا دل کے پار جاتا ہے۔ اب تم خود سمجھ دار ہو زیادہ کیا

کہوں۔“

خدا کی مار ہے دل پر میرے دل بھی نہ جانے کیوں دھڑکنے لگا۔

”مجھ پر کیوں خدا کی مار تم پر ہو خدا کی مار جو کسی کے دل میں دھرنادے کر پھر چچھا چھڑائے۔“ وہ بھی تڑپ کر بولا اور یہاں یہ حال کہ پسینے چھٹے جاتے تھے۔ عجیب لڑکا ہے جو اپنی چرب زبانی سے رام کرنا چاہتا ہے۔

”خدا کے لیے کیوں مجھے سسکا رہے ہو۔ اگر بدنام ہی کرنا ہے تو ایک دم کر دو۔“ میں نے عاجزی سے کہا۔

”کہہ دیا کہ بدنام نہیں کرنا چاہتا اب تمہیں کیسے یقین دلاؤں۔“ وہ خود بھی کچھ ہیکس سا دکھائی دے رہا تھا۔

”پھر تم کیا چاہتے ہو؟“

”دوست بن جاؤ!“

”اچھا بن گئی۔“

”یوں نہیں ہاتھ ملاؤ۔“ اس نے سلاخوں سے ہاتھ اندر ڈال دیا۔ کیا مصیبت ہے۔ ہاتھ ملاتی ہوں تو بدنامی کا غار سامنے مجھے نکل جانے کو تیار ہے اور اگر نہیں ملائی تو گرمی میں سڑا سڑا کر مار ڈالے گا اور چیخے گا الگ۔

”ملائیے ہاتھ ورنہ اب میں چلا۔ بندہ دیکھنے تو روز آئے گا۔ چاہے باغ میں آؤ یا نہ آؤ میں ڈھونڈ ہی لوں گا۔“

میں کانپ گئی۔ یعنی کہ وہ مجھے گھر تک نہ چھوڑے گا۔ میں نے جلدی سے ہاتھ بڑھا دیا۔ ہائے کوئی تو دیکھتا میری بے کسی۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا کتنا عجیب سا اس کا چہرہ ہو رہا تھا اور میں لرزی جا رہی تھی۔ دل بلیوں اچھل رہا تھا۔

”اب چھوڑ دو ہاتھ کتنے اچھے آدمی ہوں۔“ میں نے خوشامدی۔

”اچھے آدمی ہاتھ پکڑ کر چھوڑ نہیں کرتے۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو بے چین ہو رہے تھے۔

”لیکن اچھے آدمی بہادر بھی ہوا کرتے ہیں۔“ اس نے جھینپ کر آنسو پونچھ لئے اور پھر چپکے چپکے بتاتا رہا کہ وہ ایک سول سرجن کا لڑکا ہے اور ایم اے کا آخری سال ہے۔ باپ نے اسے شادی کی اجازت دے رکھی ہے کہ جس سے چاہو شادی کرو لیکن اپنا اچھا برا سوچ لینا۔ اور وہ نہ تو اوئی کہہ کر چھپ جانے والی لڑکیوں کو پسند کرتا تھا اور نہ ہی اچک اچک کر سڑکوں پر پھرنے والیوں کو۔ پھر میں نے اسے اپنے حالات بتلائے اور آخر میں نے یہ بتا دیا کہ چچی ایک بھتیجے سے میری شادی کرنے والی ہیں وہ خوب ہنسا اور بھوت کو دور کرنے کے لیے عمل کرنے کا وعدہ کیا پھر وہ چلا گیا کیونکہ چچا کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔

دو دن تک اس انوکھے ملاپ کے متعلق سوچا جو بلا کی طرح زبردستی مجھ پر چھا گیا تھا۔ ساتھ ہی یہ خیال بھی تھا کہ ان باتوں کا انجام اچھا نہ ہوگا اور راز کھل کر رہے گا۔ پھر تو سب کی لعنت ملامت ضرور مجھے اس بھیا نک قبرستان میں پہنچا دے گی۔

تیسرے دن پھر باغ پہنچ گئی اور نظریں پھانک سے لڑنے لگیں۔ تھوڑی سی دیر بعد وہ آگیا اور آتے ہی اس نے ہاتھ ملایا۔ میں لمبے لمبے قدم رکھتی اس کے پاس پہنچ گئی۔ آج تو اسے دیکھ کر سچ مچ مسرت سی ہو رہی تھی۔

”کیا مجھے اندر نہ بلاؤ گی؟“ اس نے کچھ اس طرح کہا میں میں انکار نہ کر سکی اور پھر آج تو مالی بھی اپنی بیٹی سے ملنے گیا ہوا تھا اور چچارات گئے تک آتے ہیں۔

”کتنی اچھی ہو تم شہلا!“ اس نے دونوں ہاتھ میرے شانوں پر رکھ دیئے میں کانپ کر رہ گئی۔

”دیکھو یہ حرکتیں کرو گے تو ابھی نو دو گیارہ کر دو گی۔“

”اپنے دل سے نو دو گیارہ کر تو جانوں۔“

”بڑے برے ہو تم۔“

”یعنی کہا اچھا ہوں۔“

”میں نے کب کہا اچھا۔“

”ارے بھی جب عورت کسی کو چاہے اور اسے برا بھی کہے تو مطلب اچھے ہی کے ہوتے ہیں۔ بیچاری صاف کہنے سے شرماتی

ہے۔“

”بڑے فطرت شناس ہو۔“ میں نے مسخکھ اڑایا اور وہ ڈھیٹ بھی میری ہنسی میں شریک ہو گیا۔ پھر ایک دم سر جھکا کر کچھ سوچنے

لگا۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“

”سوچ رہا ہوں سماج تمہیں میرا بننے بھی دے گا یا نہیں۔“

”یہ سب کچھ تو محبت کرنے سے پہلے سوچ لیا ہوتا۔ مجھے سماج کے خیال سے بجائے رونے کے ہنسی آرہی تھی۔“

”مذاق مت کرو شہلا، میرا دل تو کانپتا ہے۔“

”تو اپنے دل کو مضبوط پکڑ لو تا کہ نہ کانپے۔“ اس نے کوئی جواب نہ دیا اور کسی گہری فکر میں غرق ہو گیا۔

”دیکھو جی یہ سر جھکا کر بیٹھنے سے کام نہ چلے گا اور نہ ہی تمہارا مغموم چہرہ دیکھ کر دنیا کو ترس آئے گا۔ یوں سمجھ لو کہ ہندوستان میں

محبت کرنے والوں کی بہت بری گت بنتی ہے۔“ میں نے اس کا سراو پر اٹھایا اور جوں ہی پھانک پر نظر پڑی تو دم ہی نکل گیا۔ چچا

پھانک کے پاس کھڑے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے شعلے برسا رہے تھے۔

”چچا آگئے! اب کیا ہوگا۔“ میں گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

”کون ہے یہ؟“ چچا نے میرا ہاتھ کھینچا۔

”یہ.... یہ چچا.... ایک...“

”ایک عاشق ہیں آپ کے“ کیوں صاحبزادی صاحبہ۔“ چچا نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور میں اسے دیکھ رہی تھی کہ اب یہ دیدار آخری ہے۔ چچا کو ملامت سے دیکھ رہا تھا۔

”عاشق صاحب! یہاں سے تشریف لے جائیے۔ شرم نہیں آتی کہ ایک شریف گھرانے کی لڑکی کو بہکا رہے ہو۔“

”لیکن سنیے تو میرا کوئی برا ارادہ نہیں۔ میں آپ کی بھتیجی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں سول سرجن کا لڑکا ہوں اور خود اہم اے میں پڑھتا ہوں۔ اب اگر آپ چاہیں تو سب پوچھ۔۔۔۔۔“

”بس بس میاں صاحبزادے باہر جاؤ۔ مجھ جیسے جہاندیدہ کو چکر نہ دے سکو گے۔ تم کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میری لڑکی کی شادی ہوئی جائے گی۔“

”لیکن سنیے تو حضرت۔“

”لیکن ویکن کچھ نہیں۔ چپکے سے باہر جاؤ۔ آئے ہیں شادی کرنے جیسے ہم کچھ جانتے ہی نہیں۔“

آپ جانتے ہی کیا ہیں بس اتنا ہی کہ اپنی بھتیجی کے سینے پر پتھر باندھ کر کہیں ڈبو دیں۔“ وہ غصے سے کھڑا ہو گیا۔

”نکل جاؤ بد معاش!“ چچا ڈنکارے۔ میں نے اس سے آنکھوں ہی آنکھوں میں منت کی کہ مجھ پر رحم کرتے ہوئے چلے جاؤ۔

”خیر میں تو جاتا ہوں لیکن تم بڑھوں کے بگلا بھگت پن پر عمر بھر آنسو بہاتا رہو گا۔ تم بڑھے اپنی جوانی کی بدعنوانیوں کی کتنی جلدی بھول جاتے ہو۔ تمہاری آنکھیں سماج کے دکھتے ہوئے انکارے ہیں جو ہماری خوشیوں کو ہر لمحے بھسم کر دینے پر تلے رہتے ہیں اور....“ اس کا گلا بھرا آیا اور وہ تیز تیز قدم ڈالتا ہوا پھانک سے باہر نکل گیا۔

”چل گھر! چچا نے دشمنی سے مجھے کھینچا اور میں چپکی ساتھ ہوئی۔ جیسے دل ڈوبا سا جا رہا ہو۔

رات بھر چچا چچی کچھ کھسر پھسر کرتے رہے اور میں اب کیا ہوگا سوچ کر کروٹیں بدلتی رہی۔ صبح چچا صاحب نے فرمایا۔

”صاحبزادی! بس تم رہ چکیں۔ اپنا سامان درست کر دو تا کہ تمہاری اماں کو بھی تو تمہارے کرتوت معلوم ہوں۔“

”میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپکے سے سامان باندھنے لگی۔

”کہنتی تھی کہ جو ان لڑکی کو نہ بٹھاؤ، کیسے گل کھلائے ہیں اب سر پر ہاتھ رکھ کر روئیں گی۔ کیسا کیسا کہا کہ اب کر دو اب میرے سلیم کے ساتھ۔ اور اب تو بیٹی نے خود ہی تلاش کرنا شروع کر دیا۔“ چچی نے بھی چچا کے ساتھ چہکننا شروع کر دیا اور میں دم سادھے سامان باندھتی رہی۔ چچا صاحب نے پہلی گاڑی سے مجھے پارسل کر دیا۔ میری جو حالت تھی خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ یہ بڈھے جیسے انہوں نے اپنی عمریں اعتکاف میں رہ کر گزاری ہیں۔ افوہ! میں نے صرف ایک اپنا زندگی کا ساتھی بنانے کی کوشش کی تھی تو یہ آفت برپا ہو گئی اور خود نہ جانے ایک ایک وقت میں کتنوں کو اپنا بنا کے چھوڑتے ہوں گے یہ پارسا بڈھے۔ اللہ اللہ سجدے میں پڑے ہیں۔ بھلا کوئی دیکھے تو کسی طرف سے بھی گہنگار معلوم ہوتے ہیں۔ اور ہم چاہیں کتنے ہی معصوم صفت ہوں ان کی نظروں میں گہنگار ہی معلوم ہوں گے۔

اتنی جلدی گھر پہنچ جانے پر اماں متحیر ہو گئیں۔ مگر میں نے ادھر ادھر کی باتیں کر کے انہیں ٹال دیا۔ پھر بھی کب تک تیسرے دن چچا کا خط اماں کے نام آ گیا۔ جس میں انہوں نے میرے معاشقے کو خوب نمک مرچ لگا کر چٹھا بنا دیا تھا۔

”ہائے مریوں نہ گئی۔“ اماں نے سر پیٹ لیا۔

”اب کون پوچھے گا تجھے۔“ دادی نے سینہ کوٹ لیا۔

”آپا کو ذرا شرم نہ آئی اس لڑکے سے ملتے ہوئے۔“ چھوٹی بہن حقارت سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اپنا منہ چھپا لیا۔ اس وقت مجھے اپنا گھر ایک زمین سے ابھری ہوئی قبر معلوم ہو رہا تھا۔ جہاں میں گھر والوں کے طعن تشنوں کے بلے کے نیچے دبی پڑی تھی۔



ہاتھ

اس نے بچپن میں چین کے خوبصورت شہر شنکھائی کے حالات پڑھے تھے اور پھر سوتے جاگتے اس نے اپنے خوبصورت خوابوں میں دیکھا کہ وہ وہاں چلا گیا ہے۔ خوبصورت خوبصورت گلابی ہاتھوں والی لڑکیاں اسے چائے پیش کر رہی ہیں۔ خواب تو خیر خواب ہی ہوتے ہیں۔ وہ جوان ہو کر حقیقتاً تجارت کے سلسلے میں شنکھائی پہنچ گیا۔ اسے رہنے کے لیے ایک خوب صورت مکان تو مل گیا لیکن ملازمین کی کمی کسی طرح پوری نہ ہوتی تھی صرف ایک بیوقوف سالک اس کے پاس تھا جو اس کے کام انجام دینے کے لیے کسی طرح مناسب نہ تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اسے ایسے ملازمین مل جائیں جن کی خدمت سے وہ خالص چینی ماحول کا لطف اٹھا سکے لیکن انتہائی جدوجہد کے بعد بھی وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ تقریباً مایوس ہو چکا تھا لیکن ایک دن اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب ان کا ایک ہندوستانی دوست اچانک اسے ملا اور وہ اس کی مشکلات رفع کرنے کا وعدہ کرتے ہوئے اسے اپنے گھر مدعو بھی کر گیا۔ دوسرے دن وہ مقررہ وقت پر اپنے دوست کے عالیشان مکان کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے گھنی بجا کر اپنی آمد کی اطلاع دی اور پھر دیواروں کے خوبصورت نقش و نگار دیکھنے لگا۔

”اندر تشریف لائیے۔“ ایک حسین لڑکی بھڑکیلے لباس میں ملبوس ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔

”کیا مسٹر رفیق اندر تشریف رکھتے ہیں؟“ اس نے جھپکتے ہوئے سوال کیا۔

”جی ہاں!“ اس نے ایک دلکش تبسم کے ساتھ کہا اور اسے لیے ہوئے ایک وسیع کمرے میں پہنچی۔

”آپ بیٹھیں آقا ابھی آتے ہیں۔“ وہ یہ کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔ وہ حیرت سے کمرے کی سجاوٹ کو دیکھنے لگا جو ایک چھوٹی سی جنت معلوم ہو رہا تھا۔ دیواروں پر عجیب عجیب قسم کی چڑیوں کی تصویریں نقش تھیں۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب یہ خوشی کے راگ الاپتی ہوئی کمرے میں پرواز کرنے لگیں گی۔ بھاری کڑھت کے خوبصورت پردے اس طرح جھوم رہے تھے کہ انہیں دیکھ کر اپنی روح جھومتی معلوم ہونے لگی گلدانوں میں سجے ہوئے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبوئیں اس کے دل و دماغ کو معطر کر کے اسے خود کو بھلائے ہوئے تھیں۔

”اغاہ! مسٹر وقار! مجھے مسرت ہے کہ آپ نے میرے غریب خانے کو رونق بخشی۔“ وہ بہت تکلف کے ساتھ بولا۔ ”اور ہاں سب سے پہلے مجھے آپ کو یہ خوشخبری سنانا چاہیے کہ میں نے آپ کے لیے دو باسلیقہ لڑکیوں کی خدمات حاصل کر لی ہیں۔ وہ کل صبح آپ کے گھر پہنچ جائیں گی۔“

”میں آپ کا بے حد ممنون ہوں مسٹر رفیق! مجھے اس دوران جس قدر تکلیف اٹھانا پڑی ہوگی وہ آپ خوب سمجھ سکتے ہیں اور....“ اس کی نگاہ اچانک دو انتہائی خوبصورت ہاتھوں پر پڑی۔ زردی اور سرخی کے گہرے امتزاج سے چمکتے ہوئے ننھے ننھے نارنجی ہاتھ جو ہولے ہولے سٹے ہوئے پردے کو درست کر رہے تھے۔

”مسٹر وقار! چائے نوش فرمائیے۔“ رفیق نے اسے چونکادیا خوبصورت ہاتھ غائب ہو چکے تھے۔ وہ چائے پینے لگا لیکن وہ عجیب سے ہاتھ اس کے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھے۔

”مجھے چین سے عشق ہے۔“ وقار نے دوران گفتگو میں کہا اور ایک بار پھر اس کی آنکھیں ایک پردے کی طرف اٹھ گئیں جس میں سے وہ نازک نازک نارنجی ہاتھ نکلے ہوئے تھے اور وہ گہری سیاہ آنکھیں جھانک رہی تھیں۔

”کتنے پیارے ہاتھ۔“ وہ چین کی تعریف کرتے کرتے ہاتھوں کی تعریف کرنے لگا اور وقار زور سے ہنس پڑا۔

”یہ ہاتھ میری ایک مجبوظہ الحواس ملازمہ کے ہیں۔“ رفیق نے کہا اور پردہ برابر ہوا گیا۔ لیکن پھر وہ جب تک وہاں رہا اسے بار بار وہ ہاتھ کسی نہ کسی طرح دکھائی دیتے رہے۔

دوسرے دن صبح دونوں نوخیز لڑکیاں اس کے ہر حکم پر دوڑنے کے لیے موجود تھیں۔ آج وہ کسی قدر چینی ماحول کا لطف اٹھا رہا تھا لیکن نہ جانے کیوں اس کی شاعرانہ طبیعت اسے بار بار ان دو ہاتھوں کی یاد دلا دیتی اور وہ اپنے دل میں بیچاری مجبوظہ الحواس کہہ کر رہ جاتا۔

”آقا! ایک لڑکا آپ سے ملنا چاہتا ہے۔“ ملازمہ نے اندر آ کر اطلاع دی۔

”آنے دو۔“ وقار نے ایک موٹا سا گارسلگایا۔

چند منٹ بعد ملازمہ ایک خوبصورت لڑکے کو لیے حاضر ہوئی۔ لڑکا تعظیماً قدرے خم ہوا اور پھر میلے دستانوں میں ڈھکے ہوئے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے بال منڈھے ہوئے تھے اور وہ ڈھیلا ڈھیلا کثیف الباس پہنے ہوئے تھا۔ وقار نے لڑکے سے آنے کی وجہ پوچھی۔ لڑکا آہستہ آہستہ بولا۔

”آقا! میں دنیا کا ایک بدنصیب لڑکا ہوں جیسا کہ آپ میری حالت سے اندازہ کر سکتے ہیں۔ مجھے ملازمت کی تلاش ہے۔ کتنا اچھا ہو کہ آپ مجھے اپنے دولت کدے پر اپنی خدمت انجام دینے کی اجازت دیں۔“ لڑکے کی آواز میں بلا کا درد جھلک رہا تھا۔ اور اس کی بچی نظریں وقار کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔

”فی الحال مجھے ملازم کی ضرورت نہ تھی مسکین میں تمہیں مایوس نہ کروں گا۔“
 ”کتنے رحمدل ہیں آپ۔“ لڑکے کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلک رہے تھے۔
 ”میں تمہیں صرف اپنے کام پر مقرر کرتا ہوں۔“
 ”عزت افزائی ہوگی۔“

”اور ہاں تمہارا نام کیا ہے؟“
 ”آقا! اس غلام کو ناؤ کہتے ہیں۔“
 ”اچھا اب تم جا کر باہر بیٹھو۔“

لڑکا لٹے قدم دروازے تک آیا اور پردہ اٹھا کر باہر نکل گیا۔

ناؤ کو وقار کے ہاں کام کرتے کئی دن ہو گئے اور وہ بے حد سنجیدہ اور پھرتیلا لڑکا تھا۔ ہر کام اس خوبی سے انجام دیتا کہ وقار کے منہ سے واہ نکل جاتی۔ ہر چمکیلی صبح کو جب وقار اپنے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتا تو اسے ایک نئے طرز سے آراستہ پاتا۔ سب سے زیادہ عجیب پھولوں کی سجاوٹ ہوتی گلدانوں میں لگے ہوئے پھول دیکھ کر یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا کہ یہ کسی انسانی ہاتھوں کا کام ہے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا کہ کسی کے طلسمی ہاتھ در پردہ گلدستے تیار کرتے ہیں۔

جب ناؤ کو فرصت ہوتی تو وہ حسین ملازم چھو کر یوں سے باتیں کرنے کی بجائے خاموشی سے اپنے آپا کے کمرے کے سامنے زمین پر لیٹا رہتا۔ ذرا وقار کی آواز آئی اور وہ دوڑا۔ جب سے ناؤ وقار کی خدمت پر مامور ہوا تھا اسے شاید ہی کوئی حکم دینے کی ضرورت ہوئی ہو۔ ورنہ ناؤ نے تو چند ہی روز میں اس کی تمام ضروریات کو سمجھ لیا تھا اور اب وہ نہایت آسانی سے اس کے تیور دیکھ کر ہر کام انجام دے دیتا اور ناؤ وقار کی خدمت گزاری پر نازاں تھا۔

وقار اور رفیق آراستہ ڈرائیونگ روم میں بیٹھے تجارتی معاملات پر گفتگو کر رہے تھے۔ اتنے میں ناؤ چائے کی کشتی لیے داخل ہوا۔
 ”اچھا کیا کوئی اور بھی ملازم رکھ لیا ان دو لڑکیوں کے علاوہ۔“ رفیق نے ناؤ کو دیکھتے ہوئے کہا اور ناؤ کچھ جھجک گیا۔

”ہاں اس میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تمام کام خود ہی انجام دیتا ہے مجھے حکم دینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ میں اس سے بے حد خوش ہوں۔ اور بچ پوچھو تو اسی کی وجہ سے خالص چینی کا لطف آیا ہے۔“ وقار ٹاؤ کی تعریفیں کرتا تھا۔

”بڑی خوی کی بات ہے کہ تمہیں اب ملازموں کی پریشانی نہیں۔ لیکن اب میں پریشان ہوں۔“

”میری خوبصورت ہاتھوں والی ملازمہ اچانک غائب ہو گئی۔ لاکھ وہ محبوبہ الحواس سہی، لیکن اس کے ہاتھوں کی پیش کی ہوئی چائے میرے خدا وہ نہ جانے کہاں چلی گئی۔“ رفیق خوفزدہ ہو گیا۔

”وہ چلی گئی؟“ اور اس کے ساتھ وہ عجیب سی رنگت رکھنے والے نازک ہاتھ جن کی مٹھیوں میں وقار کا دل دبا ہوا تھا۔ وقار کو اس اچانک خبر نے اداس بنادیا۔ اسے کتنی تمنائیں ان ہاتھوں کو چومنے کی۔

رفیق کے رخصت ہو جانے پر وقار بدستور رنجیدہ تھا۔

”ٹاؤ!“

”آقا۔“

”تمہیں گانا آتا ہے؟“

”ہاں آقا بس یوں ہی سا۔“

”تو سناؤ۔“ وقار نے سگار خاستردان میں مسل دی اور اپنا سر بازو پر ڈال دیا۔

ٹاؤ نے ایک چینی گانا اپنی کانپتی ہوئی آواز میں شروع کیا جس کا مفہوم تھا۔

روگ لگا بیٹھا تجھ سے کر کے پریت

ٹاؤ گار ہاتھ اور وقار کی بند آنکھوں کے سامنے دو نارنجی سے ہاتھ کپکپا رہے تھے وہ ہاتھ جواب اسے دیکھنے کو نہ ملیں گے۔

”بند کرو گانا ٹاؤ۔“ وقار چلا یا اور وقار کے زرد چہرے پر سفیدی چھا گئی۔

”مجھے تمہارا گانا سن کر کوئی یاد آئے لگتا ہے ٹاؤ۔“ وہ بچوں کی طرح اپنے بازوؤں میں منہ چھپانے لگا اور ٹاؤ کی آنکھوں میں نمی آ

گئی۔

”ٹاؤ!“ وقار نے سراٹھایا۔

”جی آقا!“ ٹاؤ کا سر جھک گیا۔

”تم کیا سوچ رہے میرے متعلق؟“ وہ اس کی آنکھوں میں نمی دیکھ کر بولا۔ ”غلام کو ہمت نہیں پڑتی کہنے کے لیے۔“ ناؤ کے جسم میں لرزش تھی۔

”تم جو کہنا چاہتے ہو کہہ دو۔ اس وقت بھول جاؤ کہ میں تمہارا آقا ہوں۔“

”آپ کسی کو چاہتے ہیں۔“ اس کی آنکھوں میں تجسس تھا۔

”تم نے ٹھیک کہا ناؤ۔ میں شنگھائی میں اپنی سب سے قیمتی شے کھو چکا ہوں۔ اچھا اب تم جا سکتے ہو۔“ ناؤ پھرتی سے مڑا اور باہر نکل گیا اور وقار ایک بار پھر ان نارنجی ہاتھوں سمیت کھوئے ہوئے دل کے رنج میں غرق ہو گیا۔

وقار جس مقصد کے لیے شنگھائی میں مقیم تھا وہ پورا ہو چکا تھا۔ اس لیے اب اس کا رہنا بیکار تھا۔ حالانکہ وہ وہاں کا ماحول چھوڑنے میں بڑی تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ لیکن مجبور تھا کہ ہندوستان میں اس کا لاکھوں کا کاروبار اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ اس کی واپسی کے انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ وہ اپنی خادماؤں کو انعام دے کر رخصت کر چکا تھا لیکن ہنوز ناؤ اپنی جگہ پر خاموشی سے کام کر رہا تھا۔ جب وقار جانے کے لیے بالکل تیار ہو گیا تو اس نے ناؤ کو بھی انعام دے کر رخصت کرنا چاہا۔

”آہ! کتنا اچھا ہو کہ آپ مجھے اپنے ساتھ لیتے جائیں۔ باوفا چینی اپنے آقا کو نہیں چھوڑتا بلکہ دنیا ہی کو چھوڑ دیتا ہے۔“ ناؤ نے اپنے مخصوص دل گداز لہجے میں کہا۔ آج اس کے زرد چہرے پر سفیدی جھلک مار رہی تھی۔

”کیا تم ہندوستان میں خوش رہ سکو گے؟“

”آقا! ہندوستان مجھے خوش نہیں رکھ سکتا، بلکہ آپ کا قرب مجھے مسرت کی گود میں دے دے گا۔“

”پھر مجھے کوئی عذر نہیں۔“ وقار نے فیصلہ کر دیا۔

ناؤ خوشی خوشی تیار ہو گیا۔ جس وقت شنگھائی کے حسین مناظر ایک ایک کر کے آنکھوں سے دور ہو رہے تھے تو وقار کی پر آب آنکھوں کے سامنے وہ دو ہاتھ چھائے ہوئے تھے۔ کاش وہ ایک بار پھر ان ہاتھوں کو دیکھ سکتا۔ یہ حسرت اس کے دل میں چٹکیاں لے رہی تھی لیکن ناؤ حسب عادت سنجیدہ تھا۔ ہندوستان میں چند ماہ گزارنے کے بعد وقار ان ہاتھوں کو بھول گیا کسی اور حسن کی تلاش میں تھا۔ جو اس کا بیون ساتھی ہو۔

انسان بھی کتنا عجیب ہوتا ہے۔ یا تو وقار ناؤ کو بے حد عزیز رکھتا تھا یا وہ اس کی خدمات سے اکتا گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ ناؤ کسی کام میں غلطی کرے اور وہ اس پر چیخے۔ اسے نکالنے کی دھمکی دے لیکن ناؤ ایسا موقع ہی نہ آنے دیتا اور جب وقار باوجود کوشش کے ناؤ کی

غلطی نہ پکڑ پاتا تو اس کا حسین چہرہ غصے سے سرخ ہو جاتا۔ اتنا دولت مند اور مشہور آدمی اپنے نوکر کو حکم دینے سے ترسے۔ یہ خیال اسے ستا کر اس کے غصے کو اور بھی مشتعل کر دیتا۔ اس خیال کے تحت وہ ٹاؤ کے ہر کام میں مین میکھ نکال کر اسے جھڑکیاں دیتا، لیکن ٹاؤ انتہائی سکون سے سب سنتا اور سر جھکا دیتا۔ اس کے سر جھکانے میں بھی ایک ایسی شان ہوتی جس سے وقار کے تن بدن میں آگ سی لگ جاتی لیکن اسے پھر ٹاؤ کی غریب الوطنی مجبور کر دیتی کہ وہ اسے اپنے پاس سے علیحدہ نہ کرے۔

آخر وقار نے ایک حسین لڑکی کو شادی کے لیے انتخاب کر ہی لیا۔ اک کروڑ پتی کی شادی کی تیاریاں مہینوں سے پہلے سے ٹاؤ نے دم نہ لیا۔ وہ ہر کام میں پیش پیش تھا۔ شادی کی تاریخ سے ایک دن پہلے ٹاؤ نے احباب سے گھرے ہوئے وقار کے سامنے ایک بڑا سا بنڈل رکھتے ہوئے کہا۔

”آقا! یہ لباس عروسی میں نے اپنی پسند سے تیار کروایا ہے۔“

بنڈل کھولا گیا اور دیکھنے والے حیرت زدہ رہ گئے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ خوبصورت پھولوں کو ملا کر وہ نایاب لباس تیار کر دیا گیا ہے۔ لوگ ٹاؤ کے مذاق کی تعریف کر رہے تھے لیکن وقار ایک دم بھڑ گیا۔

”نامعقول! تم سے کس نے کہا تھا کہ یہ چینی گدڑی تیار کراؤ۔“ ٹاؤ کے ہونٹ لرز کر کھل گئے۔ لیکن آواز کوئی نہ نکلی۔ وہ لباس اٹھا کر باہر چلا گیا۔ وقار کے احباب اسے شرمندہ کر رہے تھے کہ ٹاؤ جیسے فرمانبردار ملازم سے ایسا سلوک بہت ناروا ہے لیکن وقار اپنے عجیب و غریب جذبے سے مجبور تھا۔

”میں تم کو اب تمہارے وطن بھیج دینا چاہتا ہوں کیونکہ مجھے تمہاری ضرورت نہیں رہی۔“ وقار نے ٹاؤ سے کہا۔ کیونکہ اتنی رات گئے تک وہ اسے کوٹھی کی سجاوٹ کرتے دیکھ کر اور بھی جل گیا۔

”آقا! میں خود ہی چلا جاؤں گا لیکن چاہتا ہوں کہ آپ کی رسم شادی اور دیکھ لوں۔“ ٹاؤ کی آنکھوں میں غرور جاگ اٹھا۔ وقار شرمندہ ہو کر اپنی خواب گاہ میں چلا گیا۔

دوسرے دن دلہن رخصت ہو کر آگئی تمام دن تو ایک ہنگامہ سا برپا رہا لیکن آدھی رات گزر جانے پر جیسے ہر چیز تھک کر سو گئی۔ صرف عروس نو کے دل کی دھڑکن اور چوڑیوں کی مترنم آواز ارد گرد جاگ کر رہ گئی۔ معاہدہ لڑہ خیز چیخ نے دلہن کو سہا دیا۔ کوٹھی میں ہڑ بڑ پڑ گئی۔ وقار اس ایکایکی شور کی وجہ دریافت کرنے طوعاً و کرہاً خواب گاہ سے برآمد ہوا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ ہر شخص منہ اٹھائے ٹاؤ کی کوٹھری کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔

”کیا ہوا؟“ اس نے مجمع میں گھستے ہوئے پوچھا۔

”بیچارہ!“ کسی نے کہا۔ اور اس کے سامنے ٹاؤ پڑا تھا۔ جو اپنے پسندیدہ لباس عروسی میں ملبوس تڑپ رہا تھا۔

”خودکشی کر لی اس نے۔“ کسی نے پھر کہا اور وقار ٹاؤ پر جھک گیا۔

”ٹاؤ! میرے عزیز ٹاؤ! یہ کیا کیا تم نے؟“

”آقا! ٹاؤ نہیں لی فائے کہو۔ میں نے نہ کہا تھا آپ کی شادی کا جشن دیکھ کر چلا جاؤں گا۔“ ٹاؤ یا لی فائے کی آنکھیں مطمئن ہو کر بند ہو گئیں۔ وقار کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا اور اس نے محض ہمدردی کے جذبے سے متاثر ہو کر اپنا رومال اس کے سینے سے اٹلتے ہوئے خون پر رکھ دیا لیکن پھر اچانک اس نے اپنا ہاتھ اس طرح ہٹا لیا جیسے کوئی چیز چھو گئی ہو۔ کتنی عجیب بات تھی کہ وہ ایک عورت تھی۔

ٹاؤ (لی فائے) نے ایک بار پھر آنکھ کھولی اور اپنے دونوں ہاتھ اس طرح بلند کئے جیسے وہ کسی کو بھیج لینا چاہتے ہوں۔ وقار کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ دستانوں سے آزاد وہی عجیب و غریب نارنجی ہاتھ سہارا نہ پا کر گر گئے اور وقار غش کھا کر گر پڑا۔